محرم الحرام۔ربیع الاول ۱۴۴۶ھ

جولائی۔ستمبر ۲۰۲۴ء

سہ ماہی

حکمت قرآن

لاہور

مؤسس: ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

کی شہرۂ آفاق پزیرائی اور مقبولیت کے بعد اب پیش ہے:

مختصر

بیانُ القرآن

ترجمہ مع منتخب حواشی

❁ امپورٹڈ میٹ پیپر ❁ مضبوط مراکو جلد ❁ 1248 صفحات

~~4500/-~~ روپے کے بجائے
صرف 2200/- روپے میں

فری ہوم ڈیلیوری کے ساتھ

رمضان پیکج کے سلسلے میں

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

maktaba@tanzeem.org 0301-1115348

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا
(البقرہ: ۲۶۹)

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

جلد ۴۳ شمارہ ۳

محرّم الحرام۔ ربیع الاوّل ۱۴۴۶ھ جولائی۔ ستمبر ۲۰۲۴ء

بیاد:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین ــ ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہما

مدیر مسئول: ڈاکٹر عارف رشید

مدیر:
ڈاکٹر ابصار احمد

نائب مُدیر:
حافظ خالد محمود خضر

مجلس ادارت:
حافظ عاکف سعید۔ حافظ عاطف وحید
پروفیسر محمد یونس جنجوعہ۔ مؤمن محمود
پروفیسر حافظ قاسم رضوان

یکے از مطبوعات
مرکزی انجمن خُدّام القرآن لاہور
36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون 3-35869501
ویب سائٹ : www.tanzeem.org
ای میل: publications@tanzeem.org
سالانہ زرِتعاون: 500 روپے، فی شمارہ: 125 روپے

اِس شمارے میں

حرفِ اوّل

پس چہ باید کرد اے مسلمانانِ عالم! — ڈاکٹر ابصار احمد — 3

تذکّر و تدبّر

مِلاکُ التأویل (۳۷) — ابوجعفر احمد بن ابراہیم الغرناطی — 11

فہم القرآن

ترجمۂ قرآن مجید، مع صرفی و نحوی تشریح — پروفیسر حافظ احمد یارؒ — 24

فلسفہ و تصوّف

رسالہ ''ظهور العدم بنور القدم'' — مولانا اشرف علی تھانویؒ/مکرم محمود — 35

فکر و نظر

ہمارے عقائد پر جدید تعلیم کے اثرات — پروفیسر ڈاکٹر رشید ارشد — 45

تعلیم و تعلّم

مباحثِ عقیدہ (۱۹) — مؤمن محمود — 60

کتاب نما

تعارف و تبصرہ — ادارہ — 76

بیانُ القرآن

MESSAGE OF THE QURAN — Dr. Israr Ahmad — 96

حرفِ اوّل

پس چہ باید کرد اے مسلمانانِ عالَم!

ڈاکٹر ابصار احمد

ڈیڑھ دو ماہ قبل شعبہ ادارت ماہ نامہ ’’ترجمان القرآن‘‘ کی جانب سے درج ذیل سوال چنیدہ اصحاب کو بھیج کر راہنمائی کی خواہش کی گئی:

’’عصرِ حاضر میں ایک جانب مسلم اکثریتی ملکوں میں اور دوسری طرف مسلم اقلیتی ممالک میں اسلامی احیاء کے لیے کون کون سے فکری اور عملی اقدامات کیے جانے چاہئیں؟‘‘

ہیچ مدان راقم کا جوابی مراسلہ قارئین ’’حکمتِ قرآن‘‘ کے مطالعہ کے لیے پیش خدمت ہے:

نائب مدیر جناب سلیم منصور خالد نے تاریخ کے اوراق پلٹتے ہوئے لکھا ہے کہ ماہ نامہ ’’ترجمان القرآن‘‘ بیسویں صدی میں بلند پایہ اسلامی مفکّر سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ (۱۹۰۳-۱۹۷۹ء) نے مارچ ۱۹۳۳ء میں جاری کیا۔ اس رسالے نے گزشتہ ۹۱ برسوں میں علمی، فکری اور عملی سطح پر مسلم اُمّت کی راہنمائی کی ہے۔ آج یہ تاریخی ماہ نامہ معروف اسلامی دانشور اور محقق پروفیسر خورشید احمد کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ مولانا مودودی نے اس ماہ نامہ میں اپنے اسلامی افکار کو پیش کرنے کے ساتھ لگ بھگ ایک دہائی بعد اصولی احیائی تحریک ’’جماعت اسلامی‘‘ کی تاسیس کی، جو تادمِ تحریر برصغیر کے تینوں ممالک میں قائم اور فعال ہے۔ قبل تقسیم اور پاکستان میں آٹھ دہائیوں کے دوران جماعت اسلامی فکری اور عملی اعتبار سے جن تبدیلیوں سے دوچار ہوئی ہے، اس کا ہلکا سا تنقیدی جائزہ راقم نے ’’نیرنگیٔ سیاستِ دوراں‘‘ کے عنوان کے تحت ایک تحریر میں لیا ہے۔☆ تعجب ہے کہ محترم نائب مدیر نے اپنے خط میں جماعت کا تذکرہ بالکل ہی گول کر دیا۔ اسے صرف غیر شعوری تسامح پر تو ہرگز محمول نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں اصغر گونڈوی کا شعر صورت حال کی صحیح عکاسی کرتا نظر آتا ہے: ؎

نمودِ جلوۂ بے رنگ سے ہوش اس قدر گم ہیں
کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

چلیے اگر آپ نے صرف علمی، فکری اور مسلم اُمّت کی فکری و نظری راہنمائی تک محدود رہنا ہے تو وابستگانِ فکرِ مودودی کے زیرِ انتظام پاکستان کی حد تک جو دو ادارے اسی کام کے لیے وقف ہیں، ان کا جائزہ لے لیتے ہیں۔

☆ خصوصی شمارہ سہ ماہی ’’حکمتِ قرآن‘‘، جنوری-جون ۲۰۲۳ (صفحات ۷۸-۸۳)

ستمبر ۱۹۶۳ء کو کراچی میں اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی افتتاحی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے مولانا نے اکیڈمی کے اغراض و مقاصد کے ضمن میں اہل مغرب کے مادی فلسفہ حیات کی تفہیم و تغلیط پر زور دیا اور مادر پدر آزاد جدیدیت کے طلسم کو توڑنے کا عندیہ دیا۔ اکیڈمی نے متعدد کتابیں اور تحقیقی و علمی جرائد بھی باقاعدگی سے شائع کیے ہیں۔ جرائد میں پندرہ روزہ ''معارف فیچر'' راقم دلچسپی سے دیکھتا اور اس کے مشمولات کو مفید اور معلومات افزا پاتا ہے۔ اسلامک ریسرچ اکیڈمی نے ۶۰ سالہ علمی نگارشات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک یادگاری مجلہ ''عصر حاضر میں اسلامی تہذیب کی علمی و ادبی جہتیں'' حال ہی میں شائع کیا ہے جس کے مرتّب ڈاکٹر خالد امین ہیں۔ خاکسار کی رائے میں محولہ بالا سوال اس اکیڈمی سے وابستہ ریسرچ سکالرز اور محققین کے سپرد ایک commisioned assignment کے طور پر کیا جانا چاہیے۔

دوسرا ادارہ جو نائب امیر جماعت اسلامی پروفیسر خورشید احمد صاحب نے خود ذاتی دلچسپی سے اسلام آباد میں قائم کیا وہ انسٹیٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز (IPS) ہے۔ صدر ضیاء الحق کے زمانے میں پروفیسر صاحب کے پاس کچھ عرصے کے لیے سینیٹر ہونے کے علاوہ وزارت بھی رہی اور ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کی دہائیوں میں ان کا شمار ہائی پروفائل influencers میں رہا ہے۔ اس ادارے سے بھی توقع یہ تھی کہ وہ گلوبل جیو پولیٹکل معاملات کے ساتھ اسلام کی نظریاتی اساسات اور اقدار کو بھی نمایاں کرنے میں حصہ لے گا۔ البتہ راقم کی رائے میں یہ ادارہ چند ریجنل issues پر مذاکرات اور مباحث تک محدود رہا ہے جبکہ دوسری جانب اسلام کا بھی مغربی دنیا کے مقتدر حلقوں اور اکیڈیمیا کے لیے قابلِ قبول سوفٹ امیج پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔

سوال پر مشتمل مختصر تحریر میں جناب سلیم منصور خالد نے جہاں ایک طرف عالمی سطح پر مسلمانوں کی محکومیت اور بیچارگی کا رونا رویا ہے' تو دوسری جانب خود مسلمانوں میں فکری تضادات اور انتشار کے بحران کا ذکر بھی کیا ہے۔ راقم کی رائے میں محترم نائب مدیر کا یہ انداز عصر رواں میں عمومی طور پر پائے جانے والے culture of complaint کا مظہر ہے' اور ایک طرح سے ہماری منصوص دینی تعلیمات سے مجوبی کا نتیجہ ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ یہ دنیا ''دار تکلیف'' ہے۔ اس دنیا کی زندگی میں ہمیں مکلّف ٹھہرایا گیا ہے' یعنی شرعی تکالیف (بمعنی فرائض و واجبات) ہم پر لازم ہیں اور ان پر حتی المقدور عمل کے حوالے سے ہم سے آخرت میں باز پُرس ہوگی۔

تاریخ اسلامی کے آغاز ہی سے ہمارے دینی اساطین و اسلاف حق کے ساتھ تمسک اور اعتزاز بالدین کی اہمیت اُجاگر کرتے رہے ہیں۔ خلق قرآن کے مسئلہ پر جب امام احمد بن حنبل ؒ کو 'محنة'' (inquisition) کے دوران سخت ترین حکومتی تشدد و تعذیب کا نشانہ بنایا گیا تو کچھ مسلمانوں نے افسوس کے ساتھ امام سے کہا: أو لا تری الحق کیف ظھر علیه الباطل (کیا آپ دیکھتے نہیں باطل کیسے حق پر غالب آ گیا)? اس موقع پر امام احمد بن حنبل ؒ کا جواب سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ آپؒ نے فرمایا:

كلا، ان ظهور الباطل على الحق ان تنتقل القلوب من الهدى الى الضلالة، وقلوبنا بعد لازمة للحق

''باطل کا حق پر غلبہ اور تسلط تب ہوتا ہے جب قلوب واذہان ہدایت سے گمراہی کی جانب منتقل ہو جائیں۔ (درآں حالیکہ) ہمارے دل اب بھی حق کے ساتھ چمٹے اور جڑے ہوئے ہیں۔''

چنانچہ اصل تشویش ناک صورت حال وہ ہے کہ جس میں حق انسان کے قلب میں مغلوب ہو جائے' ایمان متزلزل اور اعتزاز بالدین برائے نام رہ جائے۔ اسلام کے غلبے اور فرماں روائی کے سلسلے میں ہمارے اکابر کا ایک اہم قول بھی ملتا ہے جو از حد ہمت افزا ہے:

دولة الباطل ساعة، دولة الحق الى قيام الساعة

''باطل کی قیادت و غلبہ تھوڑے وقت کے لیے جب کہ حق کی سربلندی اور فرماں روائی قیامت تک کے لیے ہے۔''

اسی مفہوم کو شاہ عبدالقادر ؒ نے اپنے ترجمہ قرآن میں سورۃ الفتح کی آیت ۲۸ میں ''اظہارِ دین'' کی وضاحت کرتے ہوئے فوائد میں تحریر کیا ہے کہ اسلام کا غلبہ ظاہر میں بھی ایک مدّت رہا اور یہ دلیل سے ہمیشہ غالب ہے۔ تہذیبِ جدید بگ ٹٹ آزادی کے نشے میں ایسی چُور ہوئی ہے کہ اجتماعی زندگی کے دائمی آئین اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ انسان کی آزادیاں اس کی مصیبت کا سبب بن گئیں' اس لیے کہ وہ فطری حدود سے متجاوز ہو گئیں۔ انفرادیت پسندی کے ڈانڈے عمرانی اور سیاسی نقطۂ نظر سے نراج (anarchy) اور عدم اقرار (nihilism) سے جا کر مل جاتے ہیں۔ چنانچہ نٹشے کا فلسفہ خودی عدل و مساوات کی اخلاقی اقدار اور مملکت و معاشرت کی ذمہ داریوں کو ڈھکوسلا بتاتا ہے۔

جدید مغربی فلسفہ و فکر کا گہرا تنقیدی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں اخلاق و تہذیبی اقدار کی مابعد الطبیعی بنیاد (anchoring) کا اب کوئی تصور نہیں رہا۔ پولینڈ کے فلسفی زگمنٹ باؤمین کی کتاب Life in Fragments (ٹکڑوں میں بٹی زندگی) بتاتی ہے کہ یورپ اور امریکہ میں پڑھے لکھے لوگ ذہنی طور پر ایک خلا (void) اور انکارِ کُل (nihilism) میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ راگ رنگ اور فری سیکس کے پاپولر کلچر نے عوام و خواص سب کو اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے۔ گریکو رومن فکر اور عیسائیت کی وجود اور کائنات کے حوالے سے بنیادی روحانی تعبیر کو ترک اور anti-essentialist پوزیشن لینے نے ان کے پورے اسلوبِ ہستی اور بین الانسانی اندازِ تعلق کو یکسر تبدیل کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب وہاں انسان ہونا خود معرضِ خطر میں ہے اور بہت سے نام نہاد علمی مقالے اور کتابیں پوسٹ ہیومن سیناریو سے متعلق شائع ہو رہی ہیں۔ جرمن فلسفی ہائیڈیگر' ناسا کا چیف سائنس دان راموا Husserl' امریکی نفسیات دان اور سوشل نقاد ایرک فروم' ہربرٹ مارکوزے' اڈرنو اور یاک ہائمر کی اہم کتاب The Dialectic of Enlightenment کا مطالعہ مغرب کے فلسفہ روشن خیالی کو خرافات قرار

دیتا ہے۔عصرِ حاضر میں مطلقیت اور آفاقیت بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔ امریکی فلسفی ایڈم کرش (Adam Kirsch) کی کتاب The Revolt Against Humanity: Imagining a Future without Us کے مشمولات اس ضمن میں ازحد چشم کشا اور مایوس کن ہیں۔ مشل فوکو (فرانسیسی دانشور) کا تو خیال ہے کہ انسان ڈیڑھ دو سو سال میں صفحہ ہستی سے غائب (erase) ہو جائے گا۔ مغربی مفکّرین کا خیال ہے کہ چونکہ انسان نے گزشتہ تاریخی ادوار میں نیچر اور حیوانی انواع کے ساتھ منفی رویہ اختیار کیا' چنانچہ اب اس کا یہاں سے ہٹ جانا اور غائب ہو جانا ہی بہتر ہے۔ اس پوزیشن کو وہ Anthropocene Anti-humanism کا نام دیتے ہیں۔ چنانچہ ''انسانیت'' ہی کے تصور اور تعین کو بدلنا ازحد ضروری ہے۔ یعنی ہمیں ''انسان'' کے اس پورے تصور کو تج دینا ہو گا جو تمام مبنی بر وحی ادیان اور عرفانی لٹریچر میں مذکور ہے۔ آزادی' ڈویلپمنٹ' پروگریس اور لامتناہی سائنسی/ٹیکنالوجیکل ترقی کے ساتھ اب موت کو بھی شکست دینے کا دعویٰ ہے' اگرچہ اس میں یہ یقیناً کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ بہرحال دوسری جانب مغرب ہی میں بعض ایسے سنجیدہ فکر اور علمی تجزیہ وتحلیل کے مفکّرین بھی ہیں جنہوں نے متعدد اہم تصانیف میں مغرب کی ٹیکنالوجیکل اور ڈیجیٹل ترقی پر نہ صرف سخت تنقید کی ہے بلکہ اسے انسانیت کے لیے انتہائی منفی بھی قرار دیا ہے۔ ان میں متعدد دوسرے تہذیب حاضر کے نقاد مصنّفین کے ساتھ کارل آرٹر و مین اور جان گرے کے رشحاتِ قلم مغربی تہذیب وکلچر سے ازالہ سحر (disillusionment) کا کھل کر اظہار کرتے ہیں۔ مزید برآں ''ہیومن کنڈیشن'' کی کلچرل اور نفسیاتی ناہمواریوں کے بارے میں سخت ذہنی کرب اور تشویش کے ساتھ بنیادی سوالات اٹھاتے ہیں۔

راقم کا خیال ہے کہ اب مغرب میں اکیڈیمیا کے کچھ اعلیٰ حلقوں میں بنیادی علمی سوالات کو وجودی اور روحانی تناظر (perspective) میں دیکھنے کا رجحان بھی پیدا ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں یورپ اور امریکہ کے مقامی اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات وخواتین کا بالخصوص حلقہ بگوشِ اسلام ہونا اور اسلامی ممالک میں طویل عرصہ قیام پزیر رہ کر دینی علوم کو انتہائی محنت سے حاصل کرنا اور پھر اسلام کی حقانیت کو نہ صرف اپنے آبائی خطوں بلکہ بین الاقوامی سطح پر پیش کرنا قابلِ غور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وطن عزیز پاکستان اور پوری دنیا میں بالعموم قرآن وسُنّت کی تعلیمات کو اعلیٰ علمی سطح پر پیش کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ہمارا زمانہ دورِ زوال اور غربتِ اسلام کا دَور ہے۔ بانی انجمن خُدّام القرآن وتنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد ؒ نے قرآن وسنت کی تعلیمات اپنے فہم کے مطابق نصف صدی سے زیادہ عرصہ پاکستان اور کئی غیر ممالک میں انتہائی پُرجوش اور انقلاب آفریں انداز میں پھیلائیں۔ دوسری جانب بعض اسلامی دعوتی وسیاسی جماعتیں جدیدیت کی تہذیبی مرادات (پروگریس اور اقتصادی فلاح) کو مذہبی اصطلاحات کی آڑ میں آگے بڑھانے کے عمل تک محدود ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نوع کی پیوندکاری سے اب کام نہیں چلے گا۔ ضرورت سطحی باتوں اور نعروں سے باہر نکل کر دین متین کے ثوابت ومحکمات کو صحیح عقیدے کی روشنی میں اس طرح پیش کرنے کی ہے کہ وہ مفہومات سے اوپر اُٹھ کر وجودی وایمانی احوال کے طور پر محسوس ہوں۔

عصری سماجیات کے دقائق و معارف پر گہری نظر رکھنے والے جناب حامد کمال الدین رقم طراز ہیں:

''...... نظام سے تو شریعت خداوندی یہاں بہت پہلے فارغ کرائی جا چکی۔ اب تو وہ ذہنوں سے کھرچ دی جانے لگی ہے۔ ''معاشرے'' سے بے دخل ٹھہرائی جانے لگی ہے۔ ''نظام'' کی بحثیں اٹھانے والے خدارا معاملے کی صحیح پوزیشن کو سمجھیں۔ اس جنگ کا محاذ فی الوقع ''سماج'' ہے، نظام نہیں ہے۔ یعنی صحیح معنوں میں ایک غربت اسلام جو ہمیں درپیش ہے۔ یہاں آپ کو ''تعلیم عقیدہ'' کی سطح پر آنا اور جاہلیت کے ساتھ ایک گہرا اختلاف اٹھانا ہوگا۔ ایک ''سماجی محاذ'' اٹھانے تک جانا ہوگا۔ اسے ''ملتوں'' اور تہذیبوں کی آویزش بنانا ہوگا۔ مسئلے کو ''شرک اور توحید'' کی بنیاد پر لینا ہوگا' کیونکہ ہیومن ازم کے ساتھ فی الواقع ہمارا اسی نوعیت کا مسئلہ ہے۔ اس سے کم سطح کا کوئی بھی علاج مرض کو اور بھی تقویت دے گا۔''

[مصنف کی فکرانگیز کتاب ''انسان دیوتا کے حق میں پاپ'' (www.eaqaz.org) سے اقتباس]

مندرجہ بالا سطور کے مطابق ہمارے اسلامی سیکٹر کو ایکٹوازم کے غیر مؤثر افعال کو کم کر کے مؤثر اور نتیجہ خیز مشاغل کی طرف جانا چاہیے۔ معاملے کو کسی ایک عدد ''سیاسی سکیم'' یا سالوں پر محیط ''تعلیمی و تربیتی پروگرام'' میں محصور جاننا نتائج کے اعتبار سے سخت مایوس کن رہا ہے۔ ہمیں سیکولرازم' ہیومن ازم اور جدیدیت یا بالفاظِ دیگر ''ایمان بمقابلہ کفر'' کے مباحث کو فرد سے افراد اور سماج تک پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اوّل الذکر سیاسی ایکٹوازم اور مؤخر الذکر دعوتی و علمی و تعلیمی فعالیت میں جوہری تنوع ہے۔ پُرجوش تقاریر کے بجائے علمی و اصلاحی مجالس اور حلقات کا اہتمام اُمّت کی روایت میں افراد میں پائیدار ذہنی و قلبی تبدیلی لانے جبکہ سماج میں دین اور دینی شعائر کے لیے ایک غلغلہ پیدا کرنے کا کارگر منہج رہا ہے۔ چنانچہ یہ برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے دروسِ قرآنی ہی کا پھیلاؤ (proliferation) ہے کہ مرکزی انجمن خُدّام القرآن کی قرآن اکیڈمی اور قرآن کالج کے فارغ التحصیل طلبہ دینی روایت کے وارثین کا کردار ادا کرتے ہوئے دعوت و اشاعتِ قرآنی کا کام اپنے اپنے علاقوں اور حلقوں میں کر رہے ہیں۔ فَلِلّٰہِ الحمد والشکر!

محترم پروفیسر خورشید احمد گزشتہ کئی دہائیوں سے انگلستان میں مقیم ہیں اور مغرب میں شائع ہونے والی اہم کتابوں سے اغلباً انہیں آگاہی دی جاتی ہوگی۔ راقم کا خیال ہے کہ وہ کورین نژاد دانشور اور سوشل تھیورسٹ بیان چل ہان (Byung Chull Han) کے فکر سے واقفیت رکھتے ہوں گے۔ یہ فلسفی عہد حاضر میں نیولبرل ازم' کیپٹل ازم اور ڈیجیٹل ٹیکنالوجیز کے نتیجے میں ہونے والی نظاماتی تبدیلیوں اور انسانی صورت حال میں واقع ہونے والے تغیرات پر گہری نظر رکھتا ہے۔ ہان کا ایک مضمون Why Revolution is Impossible Today? ازحد اہمیت کا حامل ہے۔ مسلمان امت میں احیائی کام کرنے والوں کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ پچھلی صدی میں جتنی بھی انقلابی تحریکات اٹھی ہیں' دینی ہوں یا لادینی' وہ جس نظام کو بدلنے کی خواہش مند ہیں' وہ ''سسٹم یا نظام کیا ہے؟'' کے سوال کا کوئی نہ کوئی جواب واضح طور پر اپنے بیان میں یا اپنے تصورات میں ایک

پوشیدہ مفروضے کے طور پر رکھتی ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ انہی بیانات یا مفروضوں پر آج بھی معاملات اور تگ و تاز جاری ہے جبکہ سسٹم کے تقلبات پر چنداں توجہ نہیں دی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ انقلاب کا شوق تو آپ سے کچھ تقاضا نہیں کرتا لیکن انقلاب کا ذوق ندرتِ فکر و عمل کا طالب ضرور ہے۔ ہاں جدید ڈیجیٹل ماحول میں زیست کرنے والوں کو homo digitalis قرار دیتا ہے۔ ہر سسٹم اپنے devotional objects پیدا کرتا ہے۔ ڈیجیٹل عہد کا یہ معروض ''سمارٹ فون'' ہے جس نے فرد کو اندر باہر ہر دو طرح سے بدل دیا ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ سمارٹ فون کی سکرین پر ہر وقت مادیت اور نفس پرستی پر مبنی تصاویر اور شیطانی کلچر کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ مادہ پرستی اور فحش مظاہر و مناظر لوگوں کے مزاج کا حصہ بن گئے ہیں۔ ان مناظر سے بے شمار نفسیاتی بیماریاں اور ہماری عائلی زندگی میں تلخیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم ایک ایسے عہد میں جی رہے ہیں جو اپنی تشکیلی ساخت میں متعدد عناصر و عوامل کا ماحصل اور مرہونِ منت ہے۔ کچھ عوامل و عناصر تاریخی ہیں اور ماضی بعید سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ کچھ عناصر کو ظہور پزیر ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ تاریخی عناصر میں روم و یونان کا کردار، قرونِ وسطیٰ میں پائے جانے والے باطل عقائد اور پُرتشدد عمل، احیائے علوم، روشن خیالی، عقلیت اور اصلاحِ مذہب کی تحاریک، سائنسی انڈسٹریل انقلاب، انقلابِ فرانس وغیرہ ہیں جو تمام جغرافیائی طور پر یورپ مرکز ہیں۔ ان تمام عناصر کے مجموعی نتائج کو ہم بعنوان ''جدیدیت'' معنون کرتے ہیں جس کی علمیت، مابعد الطبیعیات اور اقدارِ ماضی کی اکثر روایتوں سے نسبتِ تضاد رکھتی ہیں۔ اسی کے نتیجے میں ایک جدید انسان نے جنم لیا جو اپنے تئیں خود آگاہ مگر حقیقتاً خود و خدا فراموش، خود مختار و خود مکتفی اور ماضی سے قطعی مختلف شعورِ خویش کا حامل تھا۔ آفاق کا حس کی شرط اور اساس پر جبکہ انفس کا جبلت کی بنا پر ادراک کرتا تھا۔ اس جدید انسان اور اس کے نظریات و تصورات کی یورپ سے ہمارے ہاں برآمد بذریعہ استعمار (colonialism) ہوئی۔

عہدِ حاضر کی تشکیلی ساخت میں وہ عناصر جو چند دہائیوں سے معرضِ وجود میں آئے ہیں وہ انفارمیشن و ڈیجیٹل ٹیکنالوجیز، سائبر سپیس اور اب مصنوعی ذہانت (AI) ہیں۔ ان کی آمد اپنے اثرات میں سب سے وسیع اور نفوذ و تاثیر میں بہت گہرا واقعہ ہے۔ یہ جدیدیت کا سب سے جدید مظہر ہے۔ جدیدیت نے جس طاقت اور معیشت کے نظام کو جنم دیا تھا اس کو سائبر سپیس کی صورت میں گھر میسر آ گیا ہے۔ علم اور تعلق کا مطلب اور دروبست تبدیل ہو گیا ہے۔ جدید معاشروں میں دینی اور روایتی زندگی کے اگر کوئی امکانات تھے تو وہ بھی کم ہوتے جا رہے ہیں۔

انسانی علوم، تعلقات، تہذیبی و ثقافتی مظاہر میں اعلیٰ و ادنیٰ، بلندی و پستی، معیاری و غیر معیاری، اخلاقی و غیر اخلاقی کی تقسیم کو محفوظ رکھنے والے خطوط و معیارات اب دھندلاتے جا رہے ہیں۔ اس کو بعض فلسفی مابعد جدیدیت قرار دیتے ہیں، لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ جدیدیت ہی کا تسلسل اور اس کے منطقی اور انتہائی نتائج ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایسی مسلسل تغیر پذیر صورت حال ہے جس سے ہم سب دوچار ہیں اور ایک جال ہے جس کا

ہم شکار ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا حاضر و موجود صورت حال کی معرفت اور جدیدیت کے کچھ نسبتاً تازہ مظاہر کو بنائے تفہیم و تجزیہ قرار دیے بغیر حالات کی درست تفہیم اور صائب نظاماتی تجزیہ (systemic analysis) ممکن ہے؟ المیہ یہ ہے کہ جدیدیت کی ایک نسبتاً پرانی تفہیم پر کلی نظاماتی تحلیل و تجزیہ کی بنا استوار کی جاتی ہے۔ نظام کی سطح پر تبدیلی کو انقلاب قرار دینا ایک خاص تاریخی صورت حال کا نتیجہ ہے اور تاریخی مؤثرات کی کارفرمائی اس میں واضح دکھائی دیتی ہے۔ بجائے انقلاب اور تبدیلی کے ان تصورات' جو اپنا ایک خاص تاریخی سیاق و سباق رکھتے ہیں' کا استناد مذہبی متون میں تلاش کیا جائے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انہیں اپنے عہد میں ہونے والے تغیرات سے متعلق رکھا جائے۔ سسٹم کی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں' انسانی نفس پر ہونے والی تاثیرات اور طاقت و معیشت کے تصوّرات میں ہونے والے تحولات کا ادراک کیا جائے اور ایسا زندہ تناظر دریافت کیا جائے جو حاضر و موجود اسلوبِ حیات سے متعلق ہو۔ دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو باطل کی نئی صورتوں اور ہیئتوں کو زیر بحث لایا جائے۔

یہ راقم کے خیال میں ایک طرح کی وہ گہری جہاں بینی ہے جسے علامہ اقبالؒ نے اس شعر میں نمایاں کیا ہے:ے

جہاں بانی سے ہے دشوارتر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشم دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

پچھلے صفحات میں کورین نژاد جرمن فلسفی بیان چل ہان کا ذکر نظاماتی تبدیلیوں اور انسانی صورت حال میں واقع تغیرات کے ضمن میں کیا گیا ہے۔ اس کا ترجمہ' مفصل وضاحت اور تحریکات کے لیے اس کی اہمیت قرآن اکیڈمی (مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور) کے ذکی الحس' بیدار شعور اور نکتہ سنج نوجوان سکالر مکرم محمود نے اپنے ایک مفصل مضمون ''نظاماتی تفہیم اور ہمہ گیر تحول کا مسئلہ''☆ میں بڑی محنت اور ژرف نگاہی کے ساتھ تحریر کی ہے۔ یہ تحریر نہایت فکر انگیز اور معلومات سے پُر ہے۔ اس کا مطالعہ داعیانِ حق کے ذہن میں علمی بصیرت اور فکری عمق پیدا کرے گا۔

ہمارے جدیدیت گزیدہ اور مغرب پرست خواتین و حضرات کے علمی و ذہنی افق پر نظر ڈال لیجیے۔ ان میں کثیر تعداد متداول علوم — سائنسی و سماجی علوم — پڑھے ہوئے ہیں' لیکن سماجی علوم وہی جن کی ترتیب و تسوید مغربی ممالک کے دانشوروں نے کی۔ چنانچہ تہذیب و تمدن کے تمام مباحث میں لادینیت والحاد ان کے اذہان کو آلودہ کر گیا۔ وہ نظریات اور ''گمانوں کے لشکر'' اور محدود فکری پیراڈائم کے اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہیں اور ''یقین کا ثبات''☆ انہیں حاصل نہیں ہے۔ آزادیٔ فکر اور ہیومن ازم کے افکار سے متاثر ہو کر یہ دانشور

☆ دیکھیے' حکمتِ قرآن' شمارہ جولائی - ستمبر ۲۰۲۲ء (صفحات ۵۱-۶۵)۔ ان کی متعدد نگارشات ماہ نامہ ''البرہان'' اور ''حکمت قرآن'' میں چھپنے والی بھی بہت وقیع اور لائق مطالعہ ہیں۔ مندرجہ بالا چند پیراگراف مکرم محمود کے مطالعات سے اخذ و استفادہ پر مبنی ہیں۔

☆ ''ساقی نامہ'' میں علامہ اقبال کے شعر میں مستعمل الفاظ:

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر — گمانوں کے لشکر' یقیں کا ثبات

حضرات خبطِ عظمت کا شکار ہو گئے ہیں۔ کاش انہوں نے کبھی کچھ وقت اور صلاحیت اپنے دین کے مطالعے میں بھی صرف کی ہوتی‘ تو انہیں معلوم ہوتا کہ مسلمان کی بنیادی شناخت مخلوق‘ عبد اور تابع فرمان وجود ہے جس کے ہر قول‘ عمل‘ نیت کا آخرت میں حساب لیا جائے گا۔ کتاب اللہ (قرآن کریم) اور سُنّتِ رسول ﷺ ہمارے لیے دو انتہائی روشن ہدایت کی قندیلیں ہیں اور ہم ایمان ویقین اور اعمال صالح اور عبودیت کے ساتھ زندگی بسر کر کے آخرت کے دائمی انعام واکرام سے نوازے جا سکتے ہیں۔

برسرِ اقتدار حلقوں کی ترجیحات اور مجبوریوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہم داعیانِ اسلام کو بہر حال اپنے حصے کا کام بھر پور انداز میں کرنا ہے اور دورِ جدید کے فتن‘ کفر والحاد اور تشکیک وارتیاب کو گہرائی میں سمجھ کر ابطال کرنا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ اور جذبہ اسلامی کے حامل افراد کے لیے قدیم ’’علم الکلام‘‘ کے اصول‘ منہج اور مباحث سے تعارف حاصل کرنا ازبس ضروری ہے۔ اسلام کی تہذیبی اور کلچرل شناخت وقوت جہاں ایک درجے میں مظاہر (وضع قطع‘ لباس وآدابِ مجلس) میں بھی ہے‘ اس کی اصل روح ایک جاندار عقیدے (ایمان بالغیب) میں ہے اور وہ ایسا واضح‘ ثابت اور محکم عقیدہ ہے جس کا اثبات ہمیں قرآن کریم کے ہر صفحے پر ملتا ہے۔ پھر اس کی پشت پر ایک کامل شریعت اور اُسوۂ رسول ﷺ ہے جس کا بیان معلوم ومتوارث مراجع رکھتا ہے۔ ایمانیات کے اسی بیانیے کو ہمارے سلف صالحین اور اَساطین اُمّت نے جنہیں اللہ تعالیٰ نے بے پناہ قوتِ اَخذ وتجزیہ سے نوازا تھا‘ نیا بصیرت افروز قالب عطا کر کے تجدیدی کارنامہ سرانجام دیا ہے اور ہمارا یہی تُراثِ علمی مغربی ڈسکورس کے غلبے اور اذہان کی غلامی اور ماتحتی کے اس دور میں تریاق کا کام کر سکتا ہے۔ داعیوں کی اعلیٰ علمی حیثیت وصلاحیت ہی سیکولر گلوبلائزیشن اور ہمارے ملک میں اس کے پھیلاؤ اور اثرات کا توڑ کر سکتی ہے۔

معاشرے میں ایمانی حقائق کی سرایت ونفوذ (osmosis) اور رفتہ رفتہ ایک خداشناس تہذیب کی بازیافت مؤسس انجمن خُدّام القرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے کتابچے ’’اسلام کی نشأۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام‘‘ میں واضح کیے گئے پروگرام کے تحت اسی وقت ممکن ہے کہ جب ہم بڑے پیمانے پر تشکیک والحاد کو علمی طور پر counter کر کے حقائق ومعارفِ دین سماج کے ذہین افراد تک مؤثر انداز میں منتقل کریں۔ اس کام کی انجام دہی حلقات‘ سلسلہ درس وتدریس یا اکیڈمی اور چھوٹی چھوٹی مجالس (collectives) کی شکل میں بھی ممکن ہے‘ جس میں طلبۂ جویانِ حق اور تشنگانِ علوم اسلامیہ مستفیض ومستفید ہوں اور اپنے قلوب واذہان کو ایمان ویقین کے نور سے منور کر رہے ہوں۔ ساتھ ہی یہ ایمان وعقیدہ ان کے وجودی احوال میں محقّق ہو کر ان کے اخلاق واعمال کو نہ صرف قرآن وسُنّت کے قالب میں ڈھال دے بلکہ وہ دینی تعلیمات واقدار کے داعی بھی بن جائیں۔ اس طرح وہ تہذیب اور معاشرے کی سطح پر حقیقی اور دیرپا اسلامی تبدیلی کا باعث بنیں۔

اللّٰھم ارنا الحق حقًّا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلًا وارزقنا اجتنابہ

مِلاکُ التأوِیل (۳۷)

تالیف: ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی
تلخیص و ترجمانی: ڈاکٹر صہیب بن عبد الغفار حسن

سُورۃُ طٰہٰ

(۲۴۱) سورۃ طٰہٰ، سورۃ النمل اور سورۃ القصص میں موسیٰ علیہ السلام کا وہ قصہ بیان ہوا ہے جس میں وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ صحرائے سینا میں سفر کر رہے تھے۔ اس قصے کی حکایت جن الفاظ میں کی گئی ہے ان میں الفاظ اور معانی کا کچھ اختلاف پایا جاتا ہے اور اسی کا سمجھنا مقصود ہے۔ پہلے ان آیات کا متن اور ترجمہ ذکر کیا جاتا ہے:

﴿وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۹ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا
بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۱۰ فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۱۱ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ
اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۱۲ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ۱۳ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا
فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۱۴ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى ۱۵
فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ۱۶ وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ۱۷ قَالَ
هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا ......﴾ (طٰہٰ)

’’کیا تمہیں موسیٰ (علیہ السلام) کے قصے کی خبر ملی ہے؟ جب اُس نے ایک آگ دیکھی تو اپنی اہلیہ سے کہا کہ میں نے ایک آگ دیکھی ہے، تم ذرا ٹھہرو (میں جاتا ہوں اور) شاید میں اس کا ایک انگارا تمہارے لیے لیتا آؤں یا آگ کے آس پاس (لوگوں سے) راستے کے بارے میں ہدایت پاؤں۔ جب وہ وہاں پہنچے تو آواز دی گئی: اے موسیٰ! یقیناً میں ہی تیرا ربّ ہوں تو تُو اپنی جوتیاں اُتار دے، کیونکہ تُو طویٰ کی مقدس وادی میں ہے۔ اور میں نے تجھے چُن لیا ہے تو جو وحی کی جائے اسے کان لگا کر سن لے! بے شک میں ہی اللہ ہوں، اور میرے علاوہ اور کوئی معبود نہیں، پس تم میری ہی عبادت کرو اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرتے رہو۔ بے شک قیامت آنے والی ہے جسے میں پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں تاکہ ہر شخص کو بدلہ دیا جائے اُس کی سعی کا۔ تو پھر تمہیں اس پر یقین رکھنے کے لیے کوئی بھی شخص جو اس پر ایمان نہیں رکھتا، روک نہ دے، ایسا شخص جو اپنی خواہشات کے پیچھے بھاگتا ہو، (تم اگر ایسا کرو گے) تو ہلاک ہو جاؤ گے! اور اے موسیٰ! تیرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟ کہا: یہ میری لاٹھی ہے جس پر میں ٹیک لگاتا ہوں......‘‘

سورۃ النمل میں ارشادفرمایا:

﴿إِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِأَهْلِهِ إِنِّيٓ آنَسْتُ نَارًا ۖ سَآتِيكُم مِّنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ آتِيكُم بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ
تَصْطَلُونَ ﴿٧﴾ فَلَمَّا جَآءَهَا نُودِيَ أَن ۢ بُورِكَ مَن فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ۖ وَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ
الْعَالَمِينَ ﴿٨﴾ يَا مُوسَىٰٓ إِنَّهُۥٓ أَنَا اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٩﴾ وَأَلْقِ عَصَاكَ ۚ﴾

''یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی اہلیہ سے کہا کہ میں نے ایک آگ دیکھی ہے' میں وہاں سے یا تو کوئی خبر لاتا ہوں یا آگ کا انگارا تاکہ تم لوگ تاپ سکو۔ تو جب وہ اس (آگ) کے پاس آیا تو اس کو آواز آئی کہ مبارک ہے وہ جو اس آگ میں ہے اور جو اس کے اردگرد ہیں' اور پاک ہے اللہ جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ اے موسیٰ! یہ تو میں ہوں' اللہ جو عزیز و حکیم ہے' تم اپنا عصا ڈال دو!''

اور سورۃ القصص میں ارشادفرمایا:

﴿فَلَمَّا قَضَىٰ مُوسَى الْأَجَلَ وَسَارَ بِأَهْلِهِۦٓ آنَسَ مِن جَانِبِ الطُّورِ نَارًا ۖ قَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوٓا إِنِّيٓ
آنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيٓ آتِيكُم مِّنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ ﴿٢٩﴾ فَلَمَّآ أَتَاهَا نُودِيَ
مِن شَاطِئِ الْوَادِ الْأَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبَارَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ أَن يَا مُوسَىٰٓ إِنِّيٓ أَنَا اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿٣٠﴾
وَأَنْ أَلْقِ عَصَاكَ ۖ﴾

''تو جب موسیٰ نے مدّت پوری کر دی اور اپنی اہلیہ کے ساتھ روانہ ہوا تو اُس نے طور کی جانب سے ایک آگ دیکھی' تو اُس نے اپنی اہلیہ سے کہا کہ مجھے آگ نظر آئی ہے' تم لوگ ٹھہرو کہ میں وہاں سے کوئی خبر یا آگ کا کوئی انگارا لاؤں تاکہ تم لوگ تاپ سکو۔ تو جب وہ اس کے پاس آیا تو خطہ مبارک میں' وادیٔ ایمن کے کنارے سے' ایک درخت سے اُسے آواز آئی: اے موسیٰ! مَیں ہوں اللہ' تمام جہانوں کا پروردگار' اور (پھر کہا): اپنا عصا ڈال دو!''

ان آیات میں اشکال اس وجہ سے پیدا ہوا کہ ان تینوں سورتوں میں ایک ہی قصہ بیان ہوا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس سفر کی داستان ہے جو انہوں نے اپنے سفر رسالت میں طے کیا تھا۔ صحرائے سینا کا سفر' آگ کا دیکھنا' پھر اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی۔ اب اس واحد سفر کے بیان میں جو حکایت کی گئی ہے' اس میں خاص طور پر الفاظ کے چناؤ میں اختلاف کیوں واقع ہوا ہے؟

الفاظ میں اختلاف کا ہونا مندرجہ ذیل جدول سے واضح ہے:

	سورۂ طٰہٰ	سورۃ النمل	سورۃ القصص
(۱)	امْكُثُوٓا إِنِّيٓ آنَسْتُ نَارًا	''امْكُثُوٓا'' کا لفظ نہیں ہے	امْكُثُوٓا إِنِّيٓ آنَسْتُ نَارًا
(۲)	لَعَلِّيٓ آتِيكُم مِّنْهَا	سَآتِيكُم مِّنْهَا (لَعَلِّيٓ کی جگہ)	لَعَلِّيٓ آتِيكُم مِّنْهَا
(۳)	بِقَبَسٍ	بِخَبَرٍ أَوْ آتِيكُم بِشِهَابٍ قَبَسٍ	بِخَبَرٍ أَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ
	(قَبَسٍ کا ذکر پہلے ہے)	(قَبَسٍ کا ذکر بعد میں ہے)	(جَذْوَةٍ بمعنی قَبَس بعد میں ہے)

		(شِهَابٍ قَبَسٍ کا ذکر ہے)	(قَبَس کی جگہ جَذْوَةٍ کا ذکر ہے)
(۴)	اُتِيْكُمْ ایک دفعہ ذکر کیا گیا	''اٰتِيْكُمْ'' کا لفظ مکرر ہے	اٰتِيْكُمْ ایک دفعہ ذکر کیا گیا
(۵)	آگ تاپنے (اصطلاء) کا ذکر نہیں ہے	''لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ'' ارشاد فرمایا	''لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ'' ارشاد فرمایا
(۶)	خبر لانے کے بجائے کہا: اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى	صرف خبر لانے کا ذکر ہے	صرف خبر لانے کا ذکر ہے

یہ وہ الفاظ ہیں جن میں اختلاف واقع ہوا ہے۔ ان اختلافات کی نوعیت زیادتی وکمی اور تقدیم یا تاخیر کی ہے' اور چونکہ یہ ایک واقعہ کا بیان ہے کہ جس میں نسخ واقع نہیں ہوسکتا' اور نہ ہی اس میں مذکورہ قسم کا اختلاف ہونا چاہیے' تو یہاں دو سوال اٹھتے ہیں:

(ا) وجہ اختلاف کیا ہے؟

(ب) اور جس جس سورت میں یہ اختلافی الفاظ واقع ہوئے ہیں تو اس خاص سورت میں ان کا وارد ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟

میں اللہ سے مدد چاہتے ہوئے اور اس کی توفیق اور ہدایت کا طلب گار ہوتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ انسان کے ذہن میں جو معقول قسم کے معانی قائم ہوتے ہیں' ان کو سوائے الفاظ کے اور کس طرح دوسروں تک پہنچایا جاسکتا ہے۔ جو الفاظ معانی کے لیے اصطلاح کا کام دیتے ہیں' ان کے اظہار کے لیے الفاظ کا ہی سہارا لیا جاتا ہے۔ اور اس بات کو ذہن نشین کرنے کے بعد یہ معلوم ہونا چاہیے کہ معانی کا بعض اوقات متعدد الفاظ سے اظہار کیا جاتا ہے۔ الفاظ و معانی کے اس تعلق کی چار اقسام ہی ہوسکتی ہیں:

(۱) لفظ اور معنیٰ دونوں متحد ہوں (یعنی ایک ہی ہوں)

(۲) لفظ اور معنی میں اختلاف ہو۔

(۳) الفاظ ایک جیسے ہوں لیکن معنی مختلف ہو

(۴) الفاظ مختلف ہوں لیکن معنی ایک ہی ہو۔

عقلی اعتبار سے یہی چار قسمیں ہوسکتی ہیں' ان سے زائد نہیں اور انہی کے مطابق ارباب عقل و خرد ایک دوسرے سے خطاب کرتے ہیں۔

پہلی قسم میں نوع اور جنس سے متعلق الفاظ آجاتے ہیں' جیسے انسان کے تحت بشریت کے اعتبار سے متعدد اشخاص کا تصور کیا جاسکتا ہے' اور جنس کے تحت اگر لفظ حیوان لیا جائے تو اس سے انسان' جانور اور پرندہ بھی مراد لیا جاسکتا ہے۔ دوسری قسم میں وہ الفاظ آجاتے ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف معنی رکھتے ہیں جیسے کالا اور سفید' یا قدرت اور عجز۔ تیسری قسم میں وہ الفاظ آجاتے ہیں جن کے معانی میں اشتراک ہوسکتا ہے جیسے لفظ ''عَيْن'' سے آنکھ بھی مراد لی جاسکتی ہے اور پانی کا چشمہ بھی۔ یعنی لفظ تو ایک ہی ہے لیکن معنی مختلف ہے۔ چوتھی قسم میں مترادف

الفاظ آجاتے ہیں جیسے شیر کے لیے اَسَد یا لَیث کوئی بھی لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لفظ مشترک ہو لیکن اس کے تحت جو معانی ہوں' وہ اپنی قوت کے اعتبار سے متفاوت ہوں۔ اور تفاوت سے یہ مقصود ہے کہ ایک لفظ اپنے معنی کے اظہار میں کسی دوسری چیز کا محتاج نہ ہو اور اس لحاظ سے وہ پہلی قسم میں شمار ہوگا' یا وہ اپنے اظہار کے لیے دوسری چیز کا محتاج ہو تو وہ تشکیک کے زمرے میں شمار ہوگا۔ جیسے کوئی ایسا اسم جو جوہر (مستقل بذاتہٖ) یا عرض (محتاج لغیرہٖ) دونوں کو شامل ہو' تو کہا جائے گا کہ اس کے معانی میں تفاوت پایا جاتا ہے۔ اگر جوہر ہو تو وہ پہلی قسم (لفظ اور معانی کا متحد ہونا) میں شمار ہوگا اور اگر عرض ہو تو وہ مُشَکِّک کہلائے گا۔

بعض الفاظ کے مجازی معنی لیے جاتے ہیں۔ یہ وہ الفاظ ہیں جنہیں خاص طور پر اپنے مُسَمّٰی کے لیے وضع نہیں کیا گیا لیکن وہ اس معنی سے مناسبت رکھتے ہیں جن کے لیے وہ وضع کیے گئے ہیں۔ ایک اور بات کا بھی خیال رکھا جائے جو کسی جملے کی ترکیب میں واقع ہوسکتی ہے' اور جسے ''لحن الخطاب'' کا نام دیا گیا ہے' یعنی بعض دفعہ ایک کلمہ مقصود ہوتا ہے لیکن اسے حذف کر دیا جاتا ہے' کیونکہ سیاق و سباق کے اعتبار سے وہ کلمہ قابلِ فہم ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد:

﴿اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ۭ فَانْفَلَقَ ……﴾ (الشعراء:۶۳)

''(اے موسیٰ علیہ السلام!) اپنے عصا کو سمندر پر مارو' تو وہ پھٹ گیا……''

اور یہاں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ''فَانْفَلَقَ'' سے پہلے لفظ ''ضَرَبَ'' محذوف ہے' یعنی ''تو اس نے مارا اور سمندر پھٹ گیا''۔ اس قسم کی کئی اور مثالیں دی جاسکتی ہیں جس کے سوائے امام کرخی (محمد بن ابراہیم) کے تمام جمہور علماء قائل ہیں' جیسے قولِ باری تعالیٰ:

﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ﴾ (البقرۃ:۱۸۴)

''تو جو تم میں سے بیمار ہو اور سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔''

یعنی جو شخص بیمار ہو اور سفر پر ہو ''اور پھر افطار کر لے'' تو پھر اس کی قضا کرے۔ تو یہ حذف ''لحن الخطاب'' کہلاتا ہے۔ اور بعض دفعہ ایک چیز کہی جاتی ہے (منطوق بہٖ) لیکن وہ ایک دوسری چیز جس کا بیان نہیں ہوا (سکوت عنہ) پر دلالت کرتی ہے۔ جیسے ارشاد فرمایا:

﴿فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ﴾ (الاسراء:۲۳) ''اور تم اپنے والدین کو اُف تک نہ کہو۔''

تو یہ بات خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے کہ جب اُف تک کہنا منع ہے تو جو چیز اس سے زیادہ ہو یعنی گالم گلوچ یا مار پیٹ تو وہ کیوں نہ منع ہوگی۔ اسے ''مفہوم'' سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے' اور جو لوگ قیاس کے منکر ہیں وہ بھی اسے تسلیم کرتے ہیں۔

یہ چند باتیں اس لیے ذکر کردیں تاکہ آگے کے مباحث کو سمجھا جاسکے۔ ان کا تعلق کسی ایک سورت کے ساتھ نہیں ہے اور نہ ہی کسی ایک خاص مقام سے۔ اور یہ بات بھی سب کے علم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر رسول کو اسی زبان کے ساتھ بھیجا ہے جو کہ اس کی قوم کی زبان تھی۔ موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی زبان عبرانی تھی اس لیے موسیٰ علیہ السلام نے

اپنی قوم سے عبرانی زبان ہی میں کلام کیا تھا۔ جہاں تک اللہ تعالیٰ کا تعلق ہے تو وہ حرف‘ آواز اور جملوں کی قید سے ماوراء ہیں۔ اس لیے جو کچھ ہماری کتاب میں وارد ہوا ہے وہ ان معانی کی حکایت ہے جو موسیٰ علیہ السلام کو دی گئیں اور جو موسیٰ علیہ السلام کا موضوعِ خطاب رہیں۔ عبرانی زبان عربی سے قریب ترین زبانوں میں سے ہے تو پھر اس بات میں کیا مانع ہے کہ عبرانی زبان میں بھی وہ اقسام کیوں نہ پائی جائیں جو کہ عربی زبان میں پائی جاتی ہیں۔ اب اس تمہید کی روشنی میں ہم ان اعتراضات کا جواب دیتے ہیں جو پہلے بیان ہوئے ہیں:

(۱) موسیٰ علیہ السلام نے اپنے گھر والوں سے آگ کی طرف جاتے ہوئے کہا تھا: ’’امۡکُثُوا ‘‘(یہاں ٹھہرو!) جو کہ سورۃ النمل میں ذکر نہیں کیا گیا۔ اب اس میں دونوں باتوں کا احتمال ہے کہ یا تو انہوں نے زبان سے یہ کلمہ ادا کیا تھا‘ یا اشارتاً کہا تھا‘ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کے گھر والوں نے قرائنِ حال سے اس بات کو سمجھ لیا ہو۔ اس لحاظ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن کی عبارت میں کہیں ان کے زبانی قول کی حکایت کی گئی ہے اور کہیں ان کے حکم کی ترجمانی کی گئی ہے جو ان کے گھر والوں نے ان کے طرزِ عمل سے سمجھا۔ اس لیے اس اعتراض میں کوئی وزن باقی نہیں رہتا۔

(۲) جہاں تک ان کا یہ کہنا: ’’لَعَلِّیۡۤ اٰتِیۡکُمۡ ‘‘ دو سورتوں میں اور ’’سَاٰتِیۡکُمۡ ‘‘ سورۃ النمل میں آیا ہے تو یہ بات ذہن میں رہے کہ حرفِ تسویف (سَ یا سَوۡفَ بمعنی عنقریب) سے مستقبل میں فعل کا حاصل ہونا سمجھا جاتا ہے اور ’’لَعَلَّ ‘‘ حرفِ ترجی (بمعنی اُمید) میں مستقبل کے معنی کے ساتھ اُمید اور لالچ کا مفہوم بھی ہے‘ اور عین ممکن ہے کہ ان کی زبان میں ان دونوں معانی کو بیان کرنے کے لیے صرف ایک ہی لفظ کافی رہا ہو‘ اور چونکہ عربی زبان میں ایسا نہ تھا اس لیے دونوں معانی کا احاطہ کرنے کے لیے دو علیحدہ علیحدہ حروف لائے گئے تاکہ جو کچھ ان کی زبان میں کہا گیا اس کی مکمل ترجمانی ہو سکے۔

(۳) سورۂ طٰہٰ میں قَبَس (انگارے) کا ذکر پہلے ہے اور خبر لانے کا بعد میں اور باقی دونوں سورتوں میں اس کا الٹ ہے‘ تو صاف سمجھ میں آتا ہے کہ اس قصہ کی حکایت میں معانی کا خیال رکھا گیا ہے‘ اور یہاں تقدیم اور تاخیر کا لحاظ رکھنا ضروری نہ تھا۔

(۴) ان آیات میں آگ کے انگارے کو تین الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے:

قَبَس: آگ کا وہ شعلہ جو ایک بڑی آگ سے لیا جاتا ہے۔

جَذۡوَۃ: آگ کا وہ انگارا جس میں آگ سلگ رہی ہوتی ہے۔

شِھَاب: آگ کا وہ انگارا جو بھڑک اٹھا ہو۔

عربی زبان کی یہ خصوصیت ہے کہ ایک ہی چیز کو ذرا سے فرق کی بنا پر مختلف نام دے دیے جاتے ہیں جیسے تلوار کے لیے سیف‘ صارم اور مُہنّد کے الفاظ آئے ہیں‘ اور کھجور کے تو بہت سے نام دیے گئے ہیں جیسے: طلع‘ ضحک‘ اغریض‘ بسر‘ زھو‘ رطب‘ تمر‘ بلح‘ سیاب۔ یہ کوئی دس نام ہیں جو کھجور کی مختلف حالتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے بتائے گئے ہیں۔ عربوں کا یہ قاعدہ بھی تھا کہ اگر کوئی چیز انتہائی قابلِ قدر ہوتی یا ان کے کلام میں کثرت سے بیان

ہوتی تو وہ اس کے متعدد نام رکھ دیتے‘ بعض چیزوں کے تو سو کے قریب نام بھی رکھے گئے۔ اس کی ضرورت اشعار میں قافیہ کی پابندی کی بنا پر پیش آئی۔ اگر عربی زبان میں یہ وسعت نہ ہوتی تو ان کا قافیہ تنگ ہو جاتا اور نظم و نثر میں گرہ لگ جاتی۔

اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسرائیلیوں کی زبان میں تو ایک معنی کو بیان کرنے کے لیے غالباً ایک ہی لفظ بولا گیا ہو لیکن ہماری زبان میں اس عبرانی لفظ کی تعبیر کے لیے ایک سے زائد اسماء ہوں تو وہ سارے کے سارے اسماء عربی زبان میں لائے گئے۔ اب چاہے اسے مترادف اسماء مراد لے لیا جائے یا یہ کہا جائے کہ ہر ایک اسم سے عبرانی لفظ کی تعبیر کی گئی ہے۔

(۵) اب رہا سورۃ النمل میں ’’اٰوْ اٰتِیْکُمْ‘‘ کی تکرار تو یہاں ایک واقعہ کی تاکید کی گئی ہے۔ یہاں معاملہ کسی امر یا نہی کا نہیں ہے‘ صرف ایک خبر کو مؤکد بنانا ہے کہ جس سے اس خبر کی سچائی کو ظاہر کیا گیا ہے۔

اب چونکہ یہاں ایک واقعہ کی حکایت حال مقصود ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ایک جگہ کسی لفظ کی تکرار ہو اور دوسری جگہ تکرار نہ ہو‘ اصل مقصود یعنی واقعہ کی سچائی کو ظاہر کرنا ہے اور عربی زبان کے اسلوب کے مطابق اس قسم کی تکرار میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(۶) جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آخری دو سورتوں میں لفظ ’’اصطلاء‘‘ لایا گیا جس سے مقصود آگ تاپنے کی ضرورت کا بیان تھا اور سورۂ طٰہٰ میں اس حاجت کا بیان نہیں کیا گیا تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک امر زائد تھا جو ان دو سورتوں میں بیان ہوا لیکن وہ سورۂ طٰہٰ کے بیان سے متعارض نہیں تھا۔ یہ قرآن کا ایک عام اسلوب ہے کہ ایک جگہ ایک واقعہ اختصار کے ساتھ بیان ہوتا ہے اور دوسری جگہ اسے تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے‘ یعنی دونوں بیانات کی روشنی میں پوری بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔

(۷) سورۂ طٰہٰ میں آگ کی طرف جانے کا سبب یہ بتایا گیا: ﴿اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى﴾ ’’یا میں آگ کے آس پاس لوگوں سے ہدایت کا راستہ پاؤں۔‘‘ یہاں وہ بات وضاحت سے بیان کی گئی ہے کہ جس کی طرف سورۃ النمل اور سورۃ القصص میں یہ کہہ کر اشارہ کیا گیا تھا کہ ’’میں تمہارے لیے ایک خبر لے کر آتا ہوں‘‘ وہ اس لیے کہ انہیں اور ان کی اہلیہ کو سوائے آگ تاپنے اور راستہ معلوم کرنے کے اور کسی چیز کی حاجت نہ تھی‘ اس لیے سورۂ طٰہٰ میں تو اس کا کھل کر بیان ہو گیا اور باقی دونوں سورتوں میں اس کی طرف اشارہ ہو گیا۔ اور ایک قصے کی حکایت کرتے وقت اس قسم کا اختلاف کوئی حقیقی اختلاف نہیں ہے‘ تو اسے تعارض نہ سمجھا جائے۔

یہاں تک تو پہلے سوال کی مختلف شقوں کا جواب تھا‘ اب دوسرے سوال کی طرف آتے ہیں کہ ہر سورت میں جو کچھ بیان کیا گیا وہ اسی سورت میں آنے کے لائق تھا۔

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جو الفاظ جس سورت میں آئے ہیں وہ اس کے فواصل اور مقاطع (ہر آیت کے آخری الفاظ اور حروف) کے مطابق وارد ہوئے ہیں۔ سورۂ طٰہٰ کے مقطع میں الف مقصورہ کثرت سے آیا ہے جیسے طٰهٰ‘ لِتَشْقٰٓى‘ تَخْشٰى اور سورت کے آخر تک یہ مقطع چلا جاتا ہے (آخری آیت میں ہے: اهْتَدٰى) اور سورۃ

النمل اور سورۃ القصص کا مقطع ہے: یاء نون (جیسے مُبِیْن ‘ مُؤْمِنِیْن) یا واؤ نون (جیسے یُوْقِنُوْنَ ‘ یَعْمَهُوْنَ)‘ یاء ہو تو اس سے قبل کسرہ ہوگا اور اگر واؤ ہو تو اس سے پہلے ضمہ ہوگا۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ دونوں سورتیں تقریباً برابر ہیں (سورۃ النمل کی ۹۳ آیات ہیں اور سورۃ القصص کی ۸۸) تو پھر دونوں کی عبارات میں فرق کیوں واقع ہوا ہے؟ جواب یہ ہے کہ دونوں میں اختصار کا اور طوالت کا فرق ہے۔ سورۃ النمل کی صرف آٹھ آیات میں یہ قصہ بیان ہوا ہے اور سورۃ القصص کا تو بڑا حصہ (تقریباً پچاس آیات) اسی قصے پر مشتمل ہے۔ اور یہ قاعدہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ جہاں ایجاز اور اختصار ہو وہاں الفاظ کے چناؤ میں وہ طوالت نہیں ہوتی جو کہ ایک تفصیلی مکالمے میں ہو سکتی ہے۔

سورۂ طٰہٰ کے ابتدائی کلمات ہی کو دیکھ لیں‘ وہاں خطاب ہمارے نبی ﷺ سے ہے:

﴿مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝۲﴾

’’ہم نے قرآن آپؐ پر اس لیے نہیں اتارا ہے کہ آپؐ مشقت کا شکار ہو جائیں۔‘‘

گویا نبی ﷺ سے انسیت کا اظہار ہو رہا ہے اور پھر اسے موسیٰ علیہ السلام کے قصے سے جوڑ دیا گیا ہے کہ کیسے اللہ تعالیٰ نے انہیں صحراء میں راستہ پانے کے اسباب مہیا کر دیے تاکہ وہ آسانی سے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکیں۔

اسی طرح باقی دونوں سورتوں میں بھی سورتوں کے مجموعی نظام سے ان آیات کا تناسب اور ملائمت ظاہر ہو جاتی ہے۔ یعنی ہر سہ سورت میں جو آیات وارد ہوئی ہیں وہ وہیں مناسبت رکھتی ہیں اور اگر انہیں دوسری جگہ رکھا جاتا تو وہ مناسبت نہ پیدا ہوتی۔ واللہ اعلم!

(۲۴۲) آیت ۱۵

﴿اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا﴾

’’بے شک قیامت آنے والی ہے جسے میں قریب قریب پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں‘‘

اور سورۂ غافر (المؤمن) میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا﴾ (آیت ۵۹)

’’بے شک قیامت آنے والی ہے‘ اس میں کوئی شک نہیں‘‘

سوال کرنے والا یہ سوال کر سکتا ہے کہ دونوں سورتوں میں قیامت کے آنے کا وصف بیان ہوا ہے لیکن دونوں میں اختلاف ہے‘ ایک میں ہے: ﴿اَكَادُ اُخْفِيْهَا﴾ اور دوسرے میں ہے: ﴿لَا رَيْبَ فِيْهَا﴾ اور دوسرا سوال یہ ہے کہ سورۂ غافر کی آیت میں حرفِ لام ’’اٰتِيَةٌ‘‘ پر اضافہ کیا گیا ہے؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ سورۂ طٰہٰ کی ابتدا ہی اس بات سے ہو رہی ہے کہ نبی ﷺ کو کفار کے کفر اور عناد کے مقابلے میں تسلی دی جائے‘ چنانچہ شروع ہی میں ارشاد فرما دیا:

﴿مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝۲﴾

’’ہم نے آپؐ پر قرآن اس لیے نہیں اتارا تاکہ آپؐ مشقت میں پڑ جائیں۔‘‘

اس کے بعد پھر کتاب کی عظمت کا تذکرہ ہے اور پھر کتاب کے نازل کرنے والے کی تعظیم اور تکبیر ہے۔ وہ اللہ ہے' آسمان اور زمین کا خالق ہے' عرش پر مستوی ہے' زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے' سب اُسی کا ہے' وہی عبادت کے لائق ہے اور تمام اسمائے حسنیٰ اسی کے لیے ہیں۔ اس کے بعد نبی ﷺ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ابتدائے سفر کے واقعات سنائے گئے اور پھر کہا کہ گو قیامت یقیناً آنے والی ہے لیکن میں خود اسے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں اور اس حد تک کہ مخلوق کے کان میں اس کے آنے کی بھنک تک نہ پڑ سکے۔ یعنی وہ ان غیبی امور میں سے ہے جن کا آنا یقینی ہے اور جن پر ایمان لانا ضروری ہے' اور چونکہ یہ بات نبی ﷺ کے گوش گزار کی جا رہی ہے جن کا قیامت پر ایمان اتنا پختہ ہے کہ یہاں اس کے بارے میں کسی شک وشبہ کی نفی کرنے کی قطعاً ضرورت نہ تھی' کیونکہ نبی اس قوتِ ایمانی کا مالک ہوتا ہے کہ جہاں شک وشبہ کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہوتی' اس لیے یہاں اس کی نفی کرنے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔

جہاں تک سورۂ غافر کی آیت کا تعلق ہے تو شروع سورت سے اس آیت تک قریشِ مکہ اور تمام کفارِ عرب سے خطاب ہے جو قیامت کے بارے میں غافل تھے بلکہ اس کے واقع ہونے کے بارے میں جھگڑا کیا کرتے تھے۔ وہی تھے جنہوں نے یہ کہا:

﴿اِنۡ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنۡيَا نَمُوۡتُ وَنَحۡيَا وَمَا نَحۡنُ بِمَبۡعُوۡثِيۡنَ ﴿۳۷﴾﴾ (المؤمنون)

''یہاں تو صرف ہماری دنیا ہی کی زندگی ہے کہ جہاں ہم جیتے مرتے ہیں اور ہم دوبارہ اٹھائے جانے والے نہیں ہیں۔''

اور پھر مذکورہ آیت سے قبل اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا:

﴿لَخَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اَكۡبَرُ مِنۡ خَلۡقِ النَّاسِ﴾ (غافر:۵۷)

''یقیناً آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنا انسانوں کے پیدا کرنے سے بڑا کام ہے۔''

اس طرح انہیں یاد دلایا گیا کہ تم اللہ کی عظمت کے سامنے عاجز اور مقہور مخلوق ہو' اور پھر جس چیز کا وہ انکار کر رہے تھے' اس کی آمد کے بارے میں بطور تاکید ''لَاٰتِيَةٌ'' کا لفظ لایا گیا ہے جس کے شروع میں لام تاکید کا اضافہ کیا گیا تاکہ اس کے آنے کے بارے میں ان کے شک وشبہ کا ازالہ کیا جا سکے۔

یوں ظاہر ہو گیا کہ ہر آیت اپنی اپنی جگہ بہترین مناسبت رکھتی ہے' اور سورۂ طٰہٰ کی آیت سورۂ غافر میں' یا غافر کی آیت طٰہٰ میں کوئی جوڑ یا مناسبت نہ رکھتی تھی' واللہ اعلم!

(۲۴۳) آیات ۲۴ تا ۳۶

﴿اِذۡهَبۡ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۲۴﴾ قَالَ رَبِّ اشۡرَحۡ لِىۡ صَدۡرِىۡ ﴿۲۵﴾ وَيَسِّرۡ لِىۡۤ اَمۡرِىۡ ﴿۲۶﴾ وَاحۡلُلۡ عُقۡدَةً مِّنۡ لِّسَانِىۡ ﴿۲۷﴾ يَفۡقَهُوۡا قَوۡلِىۡ ﴿۲۸﴾ وَاجۡعَلۡ لِّىۡ وَزِيۡرًا مِّنۡ اَهۡلِىۡ ﴿۲۹﴾ هٰرُوۡنَ اَخِى ﴿۳۰﴾ اشۡدُدۡ بِهٖۤ اَزۡرِىۡ ﴿۳۱﴾ وَاَشۡرِكۡهُ فِىۡۤ اَمۡرِىۡ ﴿۳۲﴾ كَىۡ نُسَبِّحَكَ كَثِيۡرًا ﴿۳۳﴾ وَّنَذۡكُرَكَ كَثِيۡرًا ﴿۳۴﴾ اِنَّكَ كُنۡتَ بِنَا بَصِيۡرًا ﴿۳۵﴾ قَالَ قَدۡ اُوۡتِيۡتَ سُؤۡلَكَ يٰمُوۡسٰى ﴿۳۶﴾﴾

''اب تو فرعون کی طرف جا' اُس نے سرکشی اختیار کر رکھی ہے۔ موسیٰؑ نے کہا: اے میرے رب! میرے سینے

کو کھول دے‘ اور میرا کام آسان کر دے‘ اور میری زبان کی گرہ کھول دے‘ تاکہ وہ لوگ میری بات سمجھ سکیں۔ اور میرے گھر والوں میں سے میرا ایک وزیر بنا دے‘ ہارون میرے بھائی کو۔ اور میری کمر اس سے کس دے اور اسے میرا شریک کار کر دے‘ تاکہ ہم بکثرت تیری تسبیح کر سکیں‘ اور بکثرت تجھے یاد کرتے رہیں‘ بے شک تو ہمیں خوب دیکھنے بھالنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اے موسیٰ! جو کچھ تم نے مانگا ہے وہ سب تمہیں دیا جاتا ہے۔‘‘

اور سورۃ الشعراء کی آیات میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاِذۡ نَادٰی رَبُّكَ مُوۡسٰۤی اَنِ ائۡتِ الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ۝۱۰ قَوۡمَ فِرۡعَوۡنَ ؕ اَلَا یَتَّقُوۡنَ ۝۱۱ قَالَ رَبِّ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اَنۡ یُّكَذِّبُوۡنِ ۝۱۲ وَیَضِیۡقُ صَدۡرِیۡ وَلَا یَنۡطَلِقُ لِسَانِیۡ فَاَرۡسِلۡ اِلٰی هٰرُوۡنَ ۝۱۳ وَلَهُمۡ عَلَیَّ ذَنۡۢبٌ فَاَخَافُ اَنۡ یَّقۡتُلُوۡنِ ۝۱۴﴾

’’اور جب تیرے رب نے موسیٰ کو آواز دی کہ تم ظالم قوم کے پاس جاؤ‘ قوم فرعون کے پاس‘ اور (انہیں بتا) کہ وہ کیوں نہیں (اللہ سے) ڈرتے! موسیٰ نے کہا: مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے۔ میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے‘ میری زبان کھل نہیں رہی‘ تو ہارون کی طرف بھی (وحی) بھیج! اور میں نے ان کی جانب ایک قصور کیا ہے اس لیے میں ڈرتا ہوں کہ کہیں وہ مجھے قتل نہ کر دیں۔‘‘

اور سورۃ القصص کی آیات میں ارشاد فرمایا:

﴿اُسۡلُكۡ یَدَكَ فِیۡ جَیۡبِكَ تَخۡرُجۡ بَیۡضَآءَ مِنۡ غَیۡرِ سُوۡٓءٍ ۫ وَّاضۡمُمۡ اِلَیۡكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهۡبِ فَذٰنِكَ بُرۡهَانٰنِ مِنۡ رَّبِّكَ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَمَلَا۠ئِهٖ ؕ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا قَوۡمًا فٰسِقِیۡنَ ۝۳۲ قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ قَتَلۡتُ مِنۡهُمۡ نَفۡسًا فَاَخَافُ اَنۡ یَّقۡتُلُوۡنِ ۝۳۳ --- الی قوله ---- اَنۡتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الۡغٰلِبُوۡنَ ۝۳۵﴾

’’اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں ڈال‘ وہ بغیر کسی قسم کے روگ کے چمکتا ہوا نکلے گا بالکل سفید اور اپنا خوف (زائل کرنے کے لیے) اپنے بازو کو اپنے پہلو سے ملا لے‘ تو یہ دونوں تیرے رب کی طرف سے دو معجزے ہیں فرعون اور اس کے حاشیہ برداروں (کو دکھانے) کے لیے۔ بے شک وہ ایک بدکار قوم ہیں۔ موسیٰ نے کہا: میں نے ان کا ایک آدمی قتل کر دیا تھا‘ اب مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھے بھی قتل کر ڈالیں گے .... پھر آیت ۳۵ کے آخر تک جہاں فرمایا: ’’تم دونوں اور تمہاری پیروی کرنے والے ہی غالب رہیں گے۔‘‘

سوال کرنے والا یہ سوال کر سکتا ہے کہ یہاں موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بیان ہو رہا ہے کہ وہ مبعوث ہونے کے بعد کن کن مراحل سے گزرتے ہوئے فرعون کے پاس پہنچے تھے اور پھر فرعون کے سامنے کیا کیا واقعات پیش آئے۔ یہ قصہ ان تینوں سورتوں میں بیان ہوا ہے لیکن کیا وجہ ہے کہ ہر سورت میں کچھ ایسی باتیں بیان ہوئی ہیں جو دوسری دو سورتوں میں بیان نہیں ہوئیں۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ جو کچھ ہر ایک سورت میں بیان ہوا ہے اس کی سورت کے ساتھ کیا مناسبت ہے؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ زبان کے اختلاف کی بنا پر یہ ساری حکایت معنوی طور پر بیان ہو رہی ہے‘ یعنی جو الفاظ اس زمانہ میں ادا کیے گئے ان کے معانی کو عربی زبان میں ادا کیا جا رہا

ہے اس لیے الفاظ کی ادائیگی میں اختلاف کا واقع ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ اور اس بات کا بھی خیال رہے کہ ایک مضمون کو پورے کمال سے ادا کرنے کے لیے کبھی ایک تعبیر اختیار کی جاتی ہے اور کبھی دوسری‘ اور خاص طور پر اس لیے بھی کہ عربی زبان میں کسی مفہوم کی ادائیگی کے لیے مختلف اسالیب کو اختیار کیا جاتا ہے‘ جیسے مشترک الفاظ کا اختیار کرنا‘ عموم وخصوص‘ مطلق اور مقید‘ حقیقت ومجاز اور کئی دوسرے اندازِ بیان کی صورتوں کا اعتبار کرنا شامل ہے‘ اس لیے یہ اعتراض نہیں کیا جاسکتا کہ ایک ہی قصے کو مختلف عبارات میں کیوں بیان کیا گیا ہے۔

ہم تو یہ کہیں گے کہ اگر کوئی شخص کسی عربی عبارت کو معنی کا لحاظ کرتے ہوئے بیان کرے تو اس کی حکایت میں اختلاف نظر آئے گا‘ اور اگر یہ بات ایک ہی زبان کے قول میں واقع ہوسکتی ہے تو پھر ایک زبان سے دوسری زبان میں کسی بات کو نقل کیا جائے تو ایسا فرق کیوں نہیں واقع ہوسکتا۔

ان تینوں سورتوں میں موسیٰ علیہ السلام کے مراحل زندگی کے یہ واقعات بیان ہوئے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی دعا کہ اللہ تعالیٰ ان کے سینے کو کھول دے‘ ان کے فرضِ منصبی کی ادائیگی کو آسان کردے‘ ان کی زبان کی گرہ کو کھول دے‘ تاکہ لوگ ان کی بات کو سمجھ سکیں‘ ان کے بھائی ہارون کو ان کا معاون بنادے‘ اپنے اس خوف کا اظہار کہ لوگ انہیں جھٹلائیں گے اور ان کے ہاتھ سے ایک قبطی کے قتل کی بنا پر انہیں موردِ الزام ٹھہرائیں گے‘ اور فرعون کے سامنے ظاہر ہونے والے معجزات بیان ہوئے۔

یہی وہ سات واقعات ہیں جو ان سورتوں میں اختلافِ الفاظ کے ساتھ بیان ہوئے ہیں‘ اور کسی میں ایک واقعہ بیان ہوا ہے تو کسی میں دوسرا‘ لیکن ایسا نہیں ہے کہ واقعات کے بیان میں تعارض یا اختلاف ہو۔

اور دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ سورۂ طٰہٰ کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا قصہ بیان کرکے نبی کریم ﷺ کے لیے بشارت‘ تسلی اور اطمینان کا اظہار ہو۔ اس کی ابتدا ’’رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ‘‘ سے ہوتی ہے کہ جہاں موسیٰ علیہ السلام کی دعا کا بیان ہوا ہے۔ شروع سورت میں ﴿مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ②﴾ کہہ کر نبی ﷺ کو تسلی دی گئی تھی اور پھر آخر سورت میں نبی ﷺ کی دلجوئی پر یہ سورت ختم ہو رہی ہے۔ ارشاد فرمایا: ﴿لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ؕ﴾ (آیت ۱۳۲) ’’ہم تم سے رزق نہیں مانگتے‘ یہ تو ہم ہیں جو تمہیں رزق بہم پہنچاتے ہیں۔‘‘ اور پھر آخر میں دشمنانِ رسول کو یوں دھمکی دی گئی: ﴿قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ﴾ (آیت ۱۳۵) ’’آپؐ کہہ دیجیے‘ ہر ایک اپنے انجام کا منتظر ہے تو تم بھی انتظار کرو!‘‘ تو یہ وہ وجہ ہوگئی کہ مذکورہ آیات سورۂ طٰہٰ ہی سے مناسبت رکھتی ہیں۔

جہاں تک سورۃ الشعراء اور سورۃ القصص کا تعلق ہے تو دونوں سورتیں موسیٰ علیہ السلام کے واقعاتِ زندگی کے اردگرد گھومتی ہیں۔ اب ملاحظہ ہو کہ سورۃ الشعراء میں یہ مضامین بیان ہوئے ہیں: موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کی طرف بھیجا جانا اور اسے رب کی طرف دعوت دینا‘ فرعون کا ان کے ساتھ کج بحثی کرنا‘ فرعون کا بنی اسرائیل میں سے لڑکوں کا ذبح کرنا اور لڑکیوں کو خدمت کرنے اور ذلت کی زندگی گزارنے کے لیے چھوڑ دینا‘ اور پھر موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قوم کو اس ذلت کی زندگی سے نجات دلوانا۔ اس قصے کے بیان میں موسیٰ علیہ السلام کی ابتدائی زندگی‘ مصر سے بھاگ کر مدین

جانا' شعیب علیہ السلام سے ملاقات اور فرعون کی طرف آنا۔ پھر فرعون کا قومِ موسیٰ کا پیچھا کرنا اور بالآخر ڈوب کر ہلاکت کی موت مرنا' یہ سب واقعات بیان ہوئے ہیں۔

سورۃ الشعراء میں چونکہ کئی رسولوں کا بیان ہوا ہے اور اس بات پر خاص طور پر زور دیا گیا ہے کہ جن قوموں نے اپنے رسولوں کو جھٹلایا تھا' تو پھر ان کا انجام کیا ہوا' اور اسی لحاظ سے قومِ فرعون کے اپنے بدانجام کو پہنچنا اس سورت کے مرکزی مضمون سے مناسبت رکھتا ہے۔

جہاں تک سورۃ القصص کا تعلق ہے تو اس میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی اور دلجوئی ملحوظ رکھی گئی ہے۔ شروع ہی میں فرمادیا تھا: ﴿نَتْلُوْا عَلَیْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ﴾ (آیت ۳) ''ہم آپؐ کو سناتے ہیں موسیٰ اور فرعون کا صحیح صحیح واقعہ!'' اور ان واقعات کے سنانے سے مقصود کیا ہے' اسے سورۂ ہود میں یوں بیان کیا: ﴿وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَیْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ﴾ (آیت ۱۲۰) ''رسولوں کے سب احوال ہم آپ کے سامنے آپ کے دل کی تسکین کے لیے بیان فرما رہے ہیں۔'' اور سورت کے آخر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی تسلی دی گئی کہ جس مکہ سے وہ اپنی قوم کی بنا پر ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تھے' بالآخر ایک دن وہاں واپس آئیں گے۔ فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ؕ﴾ (القصص: ۸۵) ''جس نے آپؐ پر قرآن (کی دعوت وتبلیغ) فرض کی تھی وہ آپؐ کو دوبارہ اپنی جگہ لانے والا ہے۔'' یہاں مناسبت ہے موسیٰ علیہ السلام کے اپنے مولد مصر سے نکالے جانے اور پھر مدین ہو کر واپس لوٹائے جانے سے! اب یہ بات واضح ہو گئی کہ ہر سورت میں جو آیات آئی ہیں وہ اسی سورت سے پوری مناسبت رکھتی ہیں' واللہ اعلم!

(۲۴۴) آیت ۴۷

﴿فَاْتِیٰهُ فَقُوْلَاۤ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۙ﴾

''تم دونوں اس کے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم دونوں تیرے رب کے پیغامبر ہیں تو ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو روانہ کر دو۔''

اور سورۃ الشعراء میں ارشاد فرمایا:

﴿فَاْتِیَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَاۤ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ﴿۱۶﴾ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ﴿۱۷﴾﴾

''تو پھر فرعون کے پاس جاؤ اور (اس سے) کہو کہ ہم جہانوں کے رب کے پیغامبر ہیں' تو ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو روانہ کر دو!''

یہاں دونوں آیتوں کی عبارت میں ذرا سا اختلاف ہے' ملاحظہ ہو:

سورۂ طٰہٰ	سورۃ الشعراء
(۱) فَاْتِیٰهُ (ضمیر سے فرعون مراد ہے)	فَاْتِیَا فِرْعَوْنَ (فرعون کا نام کے ساتھ ذکر ہے)
(۲) اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ (رسولَا: تثنیہ ہے اور اس کے بعد ''رَبِّكَ''، یعنی ضمیر خطاب ہے)	اِنَّا رَسُوْلُ (رسول مفرد ہے) رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (صراحت کے ساتھ کہا گیا)

موسیٰ علیہ السلام کی حکایت کے دو مرحلے ہیں۔ پہلے جب کہ وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ مدین سے صحرائے سینا میں سفر کر رہے تھے۔ یہاں صرف انہی سے خطاب کیا گیا ہے اور فرعون کے پاس جانے کی ہدایت کی گئی ہے اور پھر موسیٰ علیہ السلام کی طلب کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور دوسرا مرحلہ وہ ہے کہ جس میں ان کی طلب پوری کر دی گئی ہے اور پھر موسیٰ اور ہارون علیہما السلام دونوں سے خطاب ہے۔ یہ وہ دوسرا مرحلہ ہے جس میں عبارت کا اختلاف پیدا ہوا ہے تو اس کی وضاحت مطلوب ہے۔

جواباً ارشاد ہے کہ ایک تو وہی بات جس کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا گیا تھا کہ یہاں زبان کے اختلاف کی بنا پر لفظ بلفظ حکایت نہیں کی جا رہی ہے بلکہ اس کے مضمون اور مقصود کو بیان کیا جا رہا ہے کہ جس کی بنا پر الفاظ میں اختلاف کا ہونا ایک طبعی امر ہے۔ رہی دوسری بات کہ سورۂ طٰہٰ میں بجائے فرعون کے نام کے اس کی ضمیر لائی گئی ہے تو وہ اس لیے کہ سورۂ طٰہٰ میں مذکورہ آیت سے چند آیات قبل فرعون کا صریحاً ذکر آ چکا ہے' جہاں ارشاد ہوا تھا:

﴿اِذۡهَبَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰی ﴿۴۳﴾ فَقُوۡلَا لَهٗ قَوۡلًا لَّيِّنًا﴾ (آیت ۴۴)

''تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ' وہ سرکشی کر رہا ہے' تو تم دونوں اس سے نرمی سے بات کرنا!''

تو اس کے معاً بعد آیت ۴۷ میں دوبارہ اس کا نام لانے کی ضرورت نہ تھی' اس لیے ضمیر لائی گئی اور کہا گیا: ''فَاۡتِيٰهُ'' اور جہاں تک سورۃ الشعراء کی آیت کا تعلق ہے تو وہاں پہلے آیت ۱۰ میں کہا گیا تھا:

﴿وَاِذۡ نَادٰی رَبُّكَ مُوۡسٰۤی اَنِ ائۡتِ الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۱۰﴾ قَوۡمَ فِرۡعَوۡنَ ؕ﴾

''اور جب تیرے ربّ نے موسیٰ کو آواز دی کہ تم ظالم قوم' قومِ فرعون کے پاس جاؤ۔''

اس کے بعد چار اور آیات ہیں جن میں موسیٰ علیہ السلام اور اللہ ربّ العالمین کے درمیان بات چیت کا ذکر ہے اور پھر دوبارہ کہا گیا کہ تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ۔ تو یہاں یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ ''فَاۡتِيٰهُمۡ'' (تو ان کے پاس جاؤ) لیکن ان دونوں آیات میں فصل پیدا ہو چکا ہے' اس لیے بجائے ضمیر کے فرعون کا نام کے ساتھ ذکر ضروری تھا' اور چونکہ فرعون کے نام کے ساتھ اس کی قوم کا ذکر ذہن میں خود بخود آ جاتا ہے اس لیے صرف فرعون کہہ دینا بھی کافی تھا۔

دوسری بات یہ کہ سورۂ طٰہٰ میں رَسُوۡلَا (تثنیہ) ہے اور سورۃ الشعراء میں (رَسُوۡلُ) مفرد ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ عام قاعدے کے اعتبار سے اگر دو آدمی ہوں تو ان کے لیے تثنیہ کا لفظ لانا معروف ہے' لیکن لفظ رَسُوۡل اہلِ عرب کے نزدیک مفرد' تثنیہ اور جمع بلکہ مذکر اور مؤنث سب کے لیے آ سکتا ہے۔ جیسے کہ ذؤیب ھُذَلی کے اس شعر میں استعمال ہوا ہے۔ ؎

ألكنى اليها وخيرُ الرسُولِ أعْلَمُهُمْ بِنَواحِي الخَبَر

''مجھے اس کی طرف بھیجو اور بہترین پیغامبر وہ ہیں جو خبر کا پوری طرح احاطہ کیے ہوئے ہوں۔''

تو وہ ایک جگہ معروف و مشہور لغت کے اعتبار سے آیا ہے اور دوسری جگہ ایک دوسری قدرے غیر معروف لغت کے اعتبار سے آیا ہے' اور جو لفظ جہاں آیا ہے سیاق و سباق کے اعتبار سے اس کا وہاں آنا ہی مناسب تھا۔

اب رہی دوسری بات کہ فرعون کو مخاطب کرتے ہوئے وہ دونوں کہتے ہیں: ''اِنَّا رَسُوۡلَا رَبِّكَ'' ہم

دونوں تیرے ربّ کے پیغامبر ہیں۔ یعنی ربّ کی طرف نسبت کے ساتھ اپنا تعارف کرا رہے ہیں تو خیال رہے کہ سورۂ طٰہٰ میں نبی ﷺ کی دلجوئی اور تسلی مطلوب ہے اور اس کے لیے موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں ایسے اسلوب کو اپنایا گیا ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے لیے باعثِ شفقت اور اُنس تھا۔ جیسے ارشاد ہوا:

﴿وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ⑬﴾ (طٰہٰ)

''اور میں نے تمہیں چن لیا ہے تو پھر کان لگا کر سنو کہ کیا وحی کی جا رہی ہے۔''

اور پھر ان کے سوال کے جواب میں یہ بشارت دی جاتی ہے:

﴿قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ㊱﴾ (طٰہٰ)

''اے موسیٰ! تمہیں تمہارے تمام مطالب عطا کر دیے گئے۔''

اور پھر موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس جانے اور نرمی سے خطاب کرنے کی تلقین کی گئی:

﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا﴾ (طٰہٰ:۴۴) ''تو پھر تم دونوں اس سے نرمی سے بات کرنا۔''

اور یہی انداز سورۃ النازعات کی آیات میں بھی جھلک رہا ہے:

﴿فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ⑱ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ⑲﴾

''تو اس سے کہنا کہ آیا تم پاک ہونا چاہتے ہو؟ اور مَیں تمہیں تمہارے ربّ کی طرف جانے کا راستہ سجھاؤں تو پھر تم میں کچھ ڈر پیدا ہوگا!''

اور اسی اسلوب کو اس قول میں بھی اپنایا گیا ہے: ''اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ'' کہ ہم دونوں تیرے ربّ کے پیغامبر ہیں۔

اب آیئے سورۃ الشعراء کی طرف جہاں سختی کا اسلوب ہے‘ فرعون اور اس کی قوم کو ڈبو کر ہلاک کیے جانے کا ذکر ہے‘ وہاں بجائے ''رَبِّكَ'' (یعنی تیرے ربّ کی طرف نسبت) ربّ العالمین کہا گیا:

﴿فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ⑯﴾

''تو پھر تم دونوں کہنا کہ ہم تمام جہانوں کے ربّ کے پیغامبر ہیں۔''

یعنی اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہم اُس ربّ کے پیغامبر ہیں جو ہر چیز کا مالک ہے اور ہر چیز اور ہر شخص اُس کے قبضۂ قدرت سے باہر نہیں ہے۔ یہاں ضمیر خطاب نہیں لائی گئی کہ یہاں دلجوئی اور تسلی مقصود نہیں ہے۔

اس سے ملتا جلتا اسلوب سورۃ الانعام کی ان دو آیات میں ملاحظہ ہو:

﴿وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ﴾ (الانعام:۱۱۲) ''اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ یہ نہ کرتے''

یہاں نبی ﷺ کی دلجوئی مقصود ہے‘ اور پھر ایک طویل بیانیہ ہے جس میں مشرکین کے گھناؤنے کاموں کو گنوایا گیا ہے اور اس کے آخر میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ﴾ (الانعام:۱۳۷) ''اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا کچھ نہ کرتے۔''

یعنی جو آیت جہاں آئی ہے وہاں بہترین مناسبت رکھتی ہے‘ اور اگر اس کا اُلٹ کیا جاتا تو قطعاً مناسب نہ ہوتا۔ واللہ سبحانہ اعلم!

❁❁❁

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی ونحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم
ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان مرحوم

سُورۃُ الحِجر

آیات ۱ تا ۵

﴿الۗرٰ ۣ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ① رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ②
ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ③ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا
وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ④ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ⑤﴾

ء م ل

اَمَلَ یَأْمُلُ (ن) اَمَلًا : اُمید کرنا۔

اَمَلٌ (اسم ذات بھی ہے): اُمید۔ زیر مطالعہ آیت ۳۔

ترکیب

(آیت ۱) اٰیٰتُ مضاف ہے۔ اَلْکِتٰبِ اس کا پہلا مضاف الیہ ہے اور قُرْاٰنٍ مُّبِیْنٍ اس کا دوسرا مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے حالتِ جر میں آیا ہے۔ (آیت ۳) ذَرْ فعل امر ہے۔ اس کا جوابِ امر ہونے کی وجہ سے یَاْکُلُوْا، یَتَمَتَّعُوْا اور یُلْہِ مجزوم آئے ہیں۔ (آیت ۴) اَھْلَکْنَا کا مفعول ہونے کی وجہ سے مِنْ قَرْیَۃٍ محلاً حالتِ نصب میں ہے۔ (آیت ۵) تَسْبِقُ کا فاعل ہونے کی وجہ سے مِنْ اُمَّۃٍ محلاً حالتِ رفع میں ہے۔

ترجمہ:

الۗرٰ : ا، ل، ر
تِلْكَ : یہ
اٰیٰتُ الْکِتٰبِ : اس کتاب کی آیتیں ہیں
وَقُرْاٰنٍ مُّبِیْنٍ : اور واضح قرآن کی
رُبَمَا : بہت ہی
یَوَدُّ : خواہش کریں گے

الَّذِيْنَ : وہ لوگ جنہوں نے — كَفَرُوْا : انکار کیا
لَوْ كَانُوْا : کاش وہ ہوتے — مُسْلِمِيْنَ : فرمانبرداری کرنے والے
ذَرْهُمْ : آپؐ چھوڑ دیں ان کو — يَاْكُلُوْا : کہ وہ کھائیں
وَيَتَمَتَّعُوْا : اور فائدہ اٹھائیں — وَيُلْهِهِمُ : اور غافل کرے ان کو
الْاَمَلُ : اُمید — فَسَوْفَ : تو عنقریب
يَعْلَمُوْنَ : وہ جان لیں گے — وَمَآ اَهْلَكْنَا : اور ہم نے ہلاک نہیں کیا
مِنْ قَرْيَةٍ : کسی بھی بستی کو — اِلَّا : مگر
وَلَهَا : اس حال میں کہ اس کے لیے تھی — كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ : ایک معلوم کتاب
مَا تَسْبِقُ : آگے نہیں نکلتی — مِنْ اُمَّةٍ : کوئی بھی اُمت
اَجَلَهَا : اپنے وقت سے — وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ : اور نہ وہ پیچھے رہتے ہیں

نوٹ: كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر قوم کے لیے پہلے سے طے کر لیتا ہے کہ اس کو سننے، سمجھنے اور سنبھلنے کے لیے اتنی مہلت دی جائے گی اور اس حد تک اسے اپنی من مانی کرنے کا موقع دیا جاتا رہے گا۔ یہ مہلت جب تک باقی رہتی ہے وہ ڈھیل دیتا رہتا ہے اور سرکشی کرتے ہی فوراً اس نے کبھی بھی کسی قوم کو نہیں پکڑا۔ (تفہیم القرآن سے ماخوذ)

آیات ۶ تا ۱۳

﴿وَقَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۞٦ لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ
مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۞٧ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ۞٨ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا
الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۞٩ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ ۞١٠ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ
رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۞١١ كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ۞١٢ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ
وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ۞١٣﴾

س ل ک

سَلَكَ يَسْلُكُ (ن) سَلْكًا، سلوکًا: (۱) کسی راستہ پر چلنا۔ کسی چیز میں داخل ہونا، پڑنا (لازم) (۲) کسی راستہ پر چلانا۔ کسی چیز میں داخل کرنا، ڈالنا (متعدی) زیر مطالعہ آیت ۱۲۔

ترجمہ:

وَقَالُوْا : اور انہوں نے کہا — يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْ : اے وہ (شخص)
نُزِّلَ : نازل کیا گیا — عَلَيْهِ : جس پر

الذِّكْرُ : اس نصیحت کو

لَمَجْنُوْنٌ : یقیناً مجنون ہے

تَاْتِيْنَا : تُو آتا ہمارے پاس

اِنْ كُنْتَ : اگر تُو ہے

مَا نُنَزِّلُ : ہم نہیں اُتارتے

اِلَّا بِالْحَقِّ : مگر حق کے ساتھ

اِذًا : پھر تو

اِنَّا نَحْنُ : بے شک ہم نے ہی

الذِّكْرَ : اس نصیحت کو

لَحٰفِظُوْنَ : یقیناً حفاظت کرنے والے ہیں

اِنَّكَ : بے شک تُو

لَوْ مَا : کیوں نہیں

بِالْمَلٰٓئِكَةِ : فرشتوں کے ساتھ

مِنَ الصّٰدِقِيْنَ : سچ کہنے والوں میں سے

الْمَلٰٓئِكَةَ : فرشتوں کو

وَمَا كَانُوْٓا : اور وہ نہ ہوئے

مُّنْظَرِيْنَ : مہلت دیے ہوئے

نَزَّلْنَا : اُتارا

وَاِنَّا لَهٗ : اور بے شک ہم اس کی

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا : اور یقیناً ہم بھیج چکے ہیں (رسولوں کو)

مِنْ قَبْلِكَ : آپؐ سے پہلے

وَمَا يَاْتِيْهِمْ : اور نہیں آتا ان کے پاس

اِلَّا : سوائے اس کے کہ

فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ : پہلے لوگوں میں

مِّنْ رَّسُوْلٍ : کوئی بھی رسول

كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ : وہ لوگ اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے

كَذٰلِكَ : اسی طرح

فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ : مجرموں کے دلوں میں

بِهٖ : اس پر

سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ : پہلے لوگوں کی عادت

نَسْلُكُهٗ : ڈال دیتے ہیں ہم اس کو

لَا يُؤْمِنُوْنَ : یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے

وَقَدْ خَلَتْ : اور گزر چکی ہے

نوٹ: حفاظتِ قرآن کے وعدے میں حفاظتِ حدیث بھی داخل ہے' کیونکہ تمام اہلِ علم اس پر متفق ہیں کہ قرآن نہ تو صرف الفاظِ قرآنی کا نام ہے اور نہ ہی صرف معانی قرآنی کا' بلکہ دونوں کے مجموعے کو قرآن کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ معانی اور مضامین قرآنیہ تو دوسری کتابوں میں بھی موجود ہیں اور اسلامی تصانیف میں تو عموماً مضامین قرآنیہ ہی ہوتے ہیں' مگر ان کو قرآن نہیں کہا جاتا' کیونکہ الفاظ قرآن کے نہیں ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص قرآن کریم سے متفرق الفاظ اور جملے لے کر ایک مقالہ یا رسالہ لکھ دے تو اس کو بھی قرآن نہیں کہا جائے گا خواہ اس میں ایک لفظ بھی قرآن سے باہر کا نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن صرف اس مصحف ربانی کا نام ہے جس کے الفاظ اور معانی ساتھ ساتھ محفوظ ہیں۔

جب یہ معلوم ہوا کہ قرآن صرف الفاظِ قرآن کا نام نہیں بلکہ معانی بھی اس کا ایک جزو ہیں' تو حفاظتِ قرآن

کی جو ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں لی ہے اس میں جس طرح الفاظِ قرآنی کی حفاظت کا وعدہ ہے اسی طرح معانی اور مضامین قرآن کی حفاظت اور معنوی تحریف سے اس کو محفوظ رکھنے کا وعدہ بھی شامل ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ معانیٔ قرآن وہی ہیں جن کی تعلیم دینے کے لیے رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمایا گیا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيۡهِمۡ﴾ (النحل: ۴۴) ''تاکہ آپؐ واضح کر دیں لوگوں کے لیے اس کو جو نازل کیا گیا ان لوگوں کی طرف'' اور یہی معنی اس آیت کے ہیں: ﴿وَيُعَلِّمُكُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ﴾ (البقرۃ: ۱۵۱) ''اور وہ تعلیم دیتے ہیں تم لوگوں کو کتاب کی اور حکمت کی۔'' اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''میں تو معلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔'' اور جب رسول اللہ ﷺ کو معانیٔ قرآن کے بیان اور تعلیم کے لیے بھیجا گیا تو آپؐ نے اُمّت کو جن اقوال و افعال کے ذریعہ تعلیم دی ان ہی کا نام حدیث ہے۔ جب حدیثِ رسولؐ درحقیقت تفسیر قرآن اور معانیٔ قرآن ہیں، جن کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے، تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قرآن کے صرف الفاظ محفوظ رہ جائیں اور معانی یعنی احادیث رسولؐ ضائع ہو جائیں؟ (معارف القرآن)

آیات ۱۴ تا ۱۸

﴿وَلَوۡ فَتَحۡنَا عَلَيۡهِمۡ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوۡا فِيۡهِ يَعۡرُجُوۡنَ ۝۱۴ لَقَالُوۡۤا اِنَّمَا سُكِّرَتۡ اَبۡصَارُنَا
بَلۡ نَحۡنُ قَوۡمٌ مَّسۡحُوۡرُوۡنَ ۝۱۵ وَلَقَدۡ جَعَلۡنَا فِى السَّمَآءِ بُرُوۡجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيۡنَ ۝۱۶
وَحَفِظۡنٰهَا مِنۡ كُلِّ شَيۡطٰنٍ رَّجِيۡمٍ ۝۱۷ اِلَّا مَنِ اسۡتَرَقَ السَّمۡعَ فَاَتۡبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيۡنٌ ۝۱۸﴾

ع ر ج

عَرَجَ يَعۡرُجُ (ن) وَعَرَجَ يَعۡرِجُ (ض) عُرُوۡجًا: اوپر چڑھنا۔ زیر مطالعہ آیت ۱۴۔

مِعۡرَجٌ (ج) مَعَارِجُ: چڑھنے کا آلہ، سیڑھی۔ ﴿مِنَ اللّٰهِ ذِى الۡمَعَارِجِ﴾ (المعارج: ۳) ''اللہ کی طرف سے جو سیڑھیوں یعنی بلندیوں والا ہے۔''

عَرِجَ يَعۡرَجُ (س) عَرَجًا: لنگڑانا، لنگڑا کر چلنا۔

اَعۡرَجُ (اَفۡعَلُ الوان وعیوب پر صفت ہے): لنگڑا۔ ﴿لَيۡسَ عَلَى الۡاَعۡمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الۡاَعۡرَجِ حَرَجٌ﴾ (النور: ۶۱) ''اندھے پر کوئی گناہ نہیں ہے اور نہ ہی لنگڑے پر کوئی گناہ ہے۔''

ش ہ ب

شَهِبَ يَشۡهَبُ (س) وَشَهُبَ يَشۡهُبُ (ک) شَهَبًا: سیاہی مائل سفید ہونا۔

شَهَبَ يَشۡهَبُ (ف) شَهۡبًا: گرمی کا کسی کو جھلس دینا۔

شِهَابٌ ج شُهُبٌ: شعلہ، انگارہ۔ زیر مطالعہ آیت ۱۸۔

ترجمہ:

وَلَوۡ فَتَحۡنَا: اور اگر ہم کھول دیں	عَلَيۡهِمۡ بَابًا: ان پر ایک دروازہ

مِّنَ السَّمَآءِ : آسمان میں سے
فَظَلُّوْا فِيْهِ : پھر وہ لگیں اس میں
يَعْرُجُوْنَ : اوپر چڑھنے
لَقَالُوْٓا : توضرور کہیں گے
اِنَّمَا : کچھ نہیں سوائے اس کے کہ
سُكِّرَتْ : موندی گئیں
اَبْصَارُنَا : ہماری نگاہیں
بَلْ نَحْنُ : بلکہ ہم
قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ : جادو کیے ہوئے لوگ ہیں
وَلَقَدْ جَعَلْنَا : اور بے شک ہم نے بنائی ہیں
فِي السَّمَآءِ : آسمان میں
بُرُوْجًا : (سیاروں کی) منزلیں
وَّزَيَّنّٰهَا : اور ہم نے مزین کیا ان کو
لِلنّٰظِرِيْنَ : دیکھنے والوں کے لیے
وَحَفِظْنٰهَا : اور ہم نے محفوظ کیا ان کو
مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ : ہر دھتکارے ہوئے شیطان سے
اِلَّا : سوائے اس کے کہ
مَنِ اسْتَرَقَ : جس نے چپکے سے چرایا
السَّمْعَ : سننے کو
فَاَتْبَعَهٗ : تو پیچھے لگتا ہے اس کے
شِهَابٌ مُّبِيْنٌ : ایک روشن انگارہ

نوٹ: بعض کا قول ہے کہ بُرُوْجًا سے مراد سورج اور چاند کی منزلیں ہیں۔ عطیہؒ کہتے ہیں کہ یہ وہ جگہیں ہیں جہاں چوکی پہرے ہیں' جہاں سے سرکش شیطانوں کو مار پڑتی ہے کہ وہ بلند و بالا فرشتوں کی گفتگو نہ سن سکیں۔ فرشتوں کی باتوں کو چوری چوری سننے کے لیے جنات اوپر کو چڑھتے ہیں اور وہ ایک کے اوپر ایک ہوتے ہیں۔ جو آگے بڑھتا ہے شعلہ اس کو جلانے کے لیے لپکتا ہے۔ سننے والے کا کام شعلہ کبھی تو اس سے پہلے ہی ختم کر دیتا ہے کہ وہ اپنے ساتھی کے کان میں کچھ کہہ دے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جلنے سے پہلے وہ اپنے نیچے والے ساتھی کے کان میں کچھ کہہ دے۔ پھر وہ اپنے سے نیچے والے کو اور اسی طرح مسلسل پہنچا دے اور وہ بات زمین تک آجائے اور جادوگر یا کاہن کے کان اس سے آشنا ہو جائیں۔ پھر وہ اس کے ساتھ سو جھوٹ ملا کر لوگوں میں دون کی لیتا ہے (ابن کثیرؒ)۔ جب وہ ایک آدھ سماوی بات سچی نکلتی ہے تو ان کے معتقدین اسے ان کی سچائی کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں' اور جو خبریں جھوٹی ثابت ہوتی ہیں ان سے اغماض برتا جاتا ہے۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

آیات ۱۹ تا ۲۵

﴿وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ ۝۱۹ وَجَعَلْنَا
لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ۝۲۰ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَاۗىِٕنُهٗ ۡ وَمَا
نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۝۲۱ وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ ۚ
وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ ۝۲۲ وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ ۝۲۳ وَلَقَدْ عَلِمْنَا

الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ﴿۲۴﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ۭ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ
عَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾﴾

خ ز ن

خَزَنَ يَخْزُنُ (ن) خَزْنًا: کسی چیز کا ذخیرہ کرنا' جمع کرنا۔

خَزِيْنَةٌ ج خَزَائِنُ: ذخیرہ کرنے کی جگہ' خزانہ۔ زیر مطالعہ آیت ۲۱۔

خَازِنٌ ج خَزَنَةٌ: خزانہ کا محافظ اور ذمہ دار' داروغہ' خزانچی۔ زیر مطالعہ آیت ۲۲۔ ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ﴾ (المؤمن:۴۹) ''اور کہا انہوں نے جو آگ میں ہیں جہنم کے داروغوں سے۔''

ل ق ح

لَقَحَ يَلْقَحُ (ف) لَقْحًا: نر کھجور کا شگوفہ مادہ کھجور میں ڈالنا۔ حاملہ کرنا' باردار کرنا۔

اللَّاقِحُ: ج لَوَاقِحُ: وہ اونٹنی جو مادہ منویہ کو قبول کر لے۔ وہ ہوا جس سے درخت/ بادل باردار ہو جائیں۔ زیر مطالعہ آیت ۲۲۔

ترکیب

(آیت ۱۹) مَدَدْنَا کا مفعول هَا کی ضمیر ہے اس لیے اَلْاَرْضَ کو اس کا مفعول مقدم ماننے کی گنجائش نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اَلْاَرْضَ سے پہلے ایک فعل محذوف مانا جاتا ہے۔ (آیت ۲۰) وَمَنْ دراصل لِمَنْ ہے اور وَجَعَلْنَا سے متعلق ہے۔ ترجمہ اسی لحاظ سے ہوگا۔ (آیت ۲۱) نُنَزِّلُهٗ کی ضمیر مفعولی خَزَائِنُ کے لیے نہیں ہے بلکہ مِنْ شَيْءٍ کے لیے ہے۔ (آیت ۲۲) لَوَاقِحَ اسم الفاعل ہے۔ اس کا مفعول محذوف ہے جو سِحَابًا ہے' کیونکہ آیت کا اگلا جملہ اس کی تائید کر رہا ہے۔

ترجمہ:

وَالْاَرْضَ: اور (ہم نے پیدا کیا) زمین کو	مَدَدْنٰهَا: ہم نے (ہی) پھیلایا اس کو
وَاَلْقَيْنَا: اور ہم نے ڈالا	فِيْهَا: اس میں
رَوَاسِيَ: پہاڑوں کو	وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا: اور ہم نے اُگایا اس میں
مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ: ہر ایک موزوں چیز میں سے	وَجَعَلْنَا لَكُمْ: اور ہم نے بنایا تمہارے لیے
فِيْهَا: اس میں	مَعَايِشَ: زندگی کے سامان
وَمَنْ: اور اس کے لیے	لَّسْتُمْ لَهٗ: تم لوگ نہیں ہو جس کو
بِرٰزِقِيْنَ: رزق دینے والے	وَاِنْ: اور نہیں ہے
مِّنْ شَيْءٍ: کوئی بھی چیز	اِلَّا عِنْدَنَا: مگر ہمارے پاس

خَزَآئِنُهٗ: اس کے خزانے ہیں	وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ: اور ہم نہیں اتارتے اس کو (کسی چیز کو)
اِلَّا: مگر	بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ: ایک معلوم اندازے کے ساتھ
وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ: اور ہم نے بھیجا ہواؤں کو	لَوَاقِحَ: باردار کرنے والی ہوتے ہوئے (بادلوں کو)
فَاَنْزَلْنَا: پھر ہم نے اُتارا	مِنَ السَّمَآءِ: آسمان سے
مَآءً: کچھ پانی	فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ: پھر ہم نے پلایا تم لوگوں کو وہ (پانی)
وَمَآ اَنْتُمْ: اور تم لوگ نہیں ہو	لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ: اس کے خزانچی
وَاِنَّا لَنَحْنُ: اور بے شک یقیناً ہم ہی	نُحْيٖ: زندگی دیتے ہیں
وَنُمِيْتُ: اور ہم ہی موت دیتے ہیں	وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ: اور ہم ہی حقیقی وارث ہیں
وَلَقَدْ عَلِمْنَا: اور یقیناً ہم جان چکے ہیں	الْمُسْتَقْدِمِيْنَ: آگے بڑھنے والوں کو
مِنْكُمْ: تم میں سے	وَلَقَدْ عَلِمْنَا: اور یقیناً ہم جان چکے ہیں
الْمُسْتَاْخِرِيْنَ: پیچھے رہنے والوں کو	وَاِنَّ رَبَّكَ: اور بے شک آپ کا رب
هُوَ يَحْشُرُهُمْ: جمع کرے گا ان کو	اِنَّهٗ: یقیناً وہی
حَكِيْمٌ: حکمت والا ہے	عَلِيْمٌ: علم والا ہے

نوٹ: آیت ۲۴ میں مستقدمین اور مستاخرین سے کون لوگ مراد ہیں' اس کے متعلق مفسرین کی آراء مختلف ہیں۔ اکثریت کی رائے یہ ہے کہ مستقدمین وہ لوگ ہیں جو نماز کی صفوں میں' جہاد کی صفوں میں اور دوسرے نیک ناموں میں آگے رہنے والے ہیں اور مستاخرین وہ لوگ ہیں جو ان چیزوں میں پچھلی صفوں میں رہنے والے اور دیر کرنے والے ہیں۔ قرطبی نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ اسی آیت سے نماز میں صف اوّل اور شروع وقت میں نماز ادا کرنے کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر لوگوں کو معلوم ہوجاتا کہ اذان کہنے اور نماز کی صف اوّل میں کھڑے ہونے کی کتنی بڑی فضیلت ہے تو تمام آدمی اس کوشش میں لگ جاتے کہ پہلی ہی صف میں کھڑے ہوں' اور سب کے لیے جگہ نہ ہوتی تو قرعہ اندازی کرنا پڑتی۔

(معارف القرآن)

آیات ۲۶ تا ۳۵

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۶﴾ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾

فَاِذَا سَوَّیۡتُہٗ وَنَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ فَقَعُوۡا لَہٗ سٰجِدِیۡنَ ﴿۲۹﴾ فَسَجَدَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ کُلُّہُمۡ
اَجۡمَعُوۡنَ ﴿۳۰﴾ اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ ؕ اَبٰۤی اَنۡ یَّکُوۡنَ مَعَ السّٰجِدِیۡنَ ﴿۳۱﴾ قَالَ یٰۤاِبۡلِیۡسُ مَا لَکَ اَلَّا تَکُوۡنَ
مَعَ السّٰجِدِیۡنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ لَمۡ اَکُنۡ لِّاَسۡجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقۡتَہٗ مِنۡ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ ﴿۳۳﴾
قَالَ فَاخۡرُجۡ مِنۡہَا فَاِنَّکَ رَجِیۡمٌ ﴿۳۴﴾ وَّ اِنَّ عَلَیۡکَ اللَّعۡنَۃَ اِلٰی یَوۡمِ الدِّیۡنِ ﴿۳۵﴾

ص ل ل

صَلَّ یَصِلُّ (ض) صَلِیۡلًا: (۱) کسی چیز کا آواز کرنا۔ (۲) کسی چیز کا سڑنا۔

صَلَّالٌ (فَعَّالٌ کے وزن پر صفت): (قرآن مجید میں اس کے ایک لام کو ص میں بدل کر صَلۡصَالٌ لکھا گیا ہے)۔ سڑی ہوئی خشک مٹی جو بجتی ہے یعنی آواز کرتی ہے۔ زیر مطالعہ آیت ۲۶۔

ح م ء

حَمَأَ یَحۡمَؤُ (ف) حَمۡأً: کنویں سے کیچڑ نکالنا۔

حَمَأٌ (اسم ذات بھی ہے): کیچڑ، گارا۔ زیر مطالعہ آیت ۲۶۔

حَمِئَۃٌ: دلدل۔ ﴿حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ مَغۡرِبَ الشَّمۡسِ وَجَدَہَا تَغۡرُبُ فِیۡ عَیۡنٍ حَمِئَۃٍ﴾ (الکہف:۸۶)
’’یہاں تک کہ جب وہ پہنچے سورج کے غروب ہونے کی جگہ پر تو انہوں نے پایا کہ وہ غروب ہوتا ہے ایک دلدل والے چشمے میں۔‘‘

ترجمہ:

وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا: اور یقیناً ہم نے پیدا کیا ہے	الۡاِنۡسَانَ: انسان کو
مِنۡ صَلۡصَالٍ: ایسی کھنکتی مٹی سے جو	مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ: گیلے گارے سے تھی
وَالۡجَآنَّ: اور جنّ کو	خَلَقۡنٰہُ: ہم نے پیدا کیا اس کو
مِنۡ قَبۡلُ: اس سے پہلے	مِنۡ نَّارِ السَّمُوۡمِ: لُو کی آگ سے
وَاِذۡ قَالَ: اور جب کہا	رَبُّکَ: آپؐ کے رب نے
لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ: فرشتوں سے	اِنِّیۡ: کہ میں
خَالِقٌۢ: تخلیق کرنے والا ہوں	بَشَرًا: ایک بشر
مِّنۡ صَلۡصَالٍ: ایسی کھنکتی مٹی سے جو	مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ: گیلے گارے سے ہے
فَاِذَا: پھر جب	سَوَّیۡتُہٗ: مَیں نوک پلک درست کرلوں اس کی
وَنَفَخۡتُ: اور مَیں پھونک دوں	فِیۡہِ: اس میں
مِنۡ رُّوۡحِیۡ: اپنی روح میں سے	فَقَعُوۡا: تو تم لوگ گر پڑنا
لَہٗ: اس کے لیے	سٰجِدِیۡنَ: سجدہ کرنے والے ہوتے ہوئے

فَسَجَدَ : پھر سجدہ کیا — الْمَلٰٓئِکَۃُ : فرشتوں نے

کُلُّھُمْ : ان کے ہر ایک نے — اَجْمَعُوْنَ : سب کے سب نے

اِلَّآ اِبْلِیْسَ : سوائے ابلیس کے — اَبٰٓی : اس نے انکار کیا

اَنْ یَّکُوْنَ : کہ وہ ہو — مَعَ السّٰجِدِیْنَ : سجدہ کرنے والوں کے ساتھ

قَالَ : کہا (اللہ تعالیٰ نے) — یٰٓاِبْلِیْسُ : اے ابلیس

مَا لَکَ : تجھے کیا ہے — اَلَّا تَکُوْنَ : کہ تُو نہ ہوا

مَعَ السّٰجِدِیْنَ : سجدہ کرنے والوں کے ساتھ — قَالَ لَمْ اَکُنْ : اُس نے کہا میں نہیں تھا

لِاَسْجُدَ : کہ میں سجدہ کروں — لِبَشَرٍ : ایک ایسے بشر کے لیے

خَلَقْتَہٗ : تُو نے تخلیق کیا جس کو — مِنْ صَلْصَالٍ : ایسی کھنکتی مٹی سے جو

مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ : گیلے گارے سے ہے — قَالَ : کہا (اللہ تعالیٰ نے)

فَاخْرُجْ : پھر تو نکل — مِنْھَا : اس (جگہ) سے

فَاِنَّکَ : پس بے شک تو — رَجِیْمٌ : دھتکارا ہوا ہے

وَّاِنَّ عَلَیْکَ : اور بے شک تجھ پر — اللَّعْنَۃَ : لعنت ہے

اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ : بدلے کے دن تک

نوٹ: یہاں قرآن اس امر کی صاف تصریح کرتا ہے کہ انسان حیوانی منازل سے ترقی کرتا ہوا بشریت کے حدود میں نہیں آیا، جیسا کہ نئے دور کے ڈارون سے متاثر کچھ مفسرین قرآن ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، بلکہ اس کی تخلیق کی ابتدا براہِ راست ارضی مادوں سے ہوئی ہے جن کی کیفیت اللہ تعالیٰ نے صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ کے الفاظ میں بیان فرمائی ہے۔ یہ الفاظ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ خمیر اُٹھی ہوئی مٹی کا ایک پتلا بنایا گیا تھا جو بننے کے بعد خشک ہوا اور پھر اس کے اندر روح پھونکی گئی۔ (تفہیم القرآن)

آیات ۳۶ تا ۴۴

﴿قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿۳۶﴾ قَالَ فَاِنَّکَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ﴿۳۷﴾ اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ
الْمَعْلُوْمِ ﴿۳۸﴾ قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ لَاُزَیِّنَنَّ لَھُمْ فِی الْاَرْضِ وَلَاُغْوِیَنَّھُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۳۹﴾ اِلَّا
عِبَادَکَ مِنْھُمُ الْمُخْلَصِیْنَ ﴿۴۰﴾ قَالَ ھٰذَا صِرَاطٌ عَلَیَّ مُسْتَقِیْمٌ ﴿۴۱﴾ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ
عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ﴿۴۲﴾ وَاِنَّ جَھَنَّمَ لَمَوْعِدُھُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۴۳﴾ لَھَا
سَبْعَۃُ اَبْوَابٍ ؕ لِکُلِّ بَابٍ مِّنْھُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴿۴۴﴾﴾

ترجمہ:

قَالَ: (ابلیس نے) کہا

رَبِّ: اے میرے ربّ

فَاَنْظِرْنِیْٓ: پس تو مہلت دے مجھ کو

اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ: لوگوں کو اٹھائے جانے کے دن تک

قَالَ: (اللہ نے) کہا

فَاِنَّكَ: پس بے شک تو

مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ: مہلت دیے ہوؤں میں سے ہے

اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ: اس معلوم وقت کے دن تک

قَالَ: (ابلیس نے) کہا

رَبِّ: اے میرے ربّ

بِمَآ: بسبب اس کے جو

اَغْوَیْتَنِیْ: تُو نے گمراہ کیا مجھ کو

لَاُزَیِّنَنَّ: میں لازماً سجاؤں گا

لَهُمْ: ان کے لیے

فِی الْاَرْضِ: زمین میں

وَلَاُغْوِیَنَّهُمْ: اور میں لازماً گمراہ کروں گا

اَجْمَعِیْنَ: سب کے سب کو

اِلَّا عِبَادَكَ: سوائے تیرے بندوں کے

مِنْهُمُ: ان میں سے

الْمُخْلَصِیْنَ: (جو) ملاوٹ سے پاک کیے ہوئے ہیں

قَالَ هٰذَا: (اللہ نے) کہا یہ

صِرَاطٌ عَلَیَّ مُسْتَقِیْمٌ: مجھ پر (یعنی مجھ تک) ایک سیدھا راستہ ہے

اِنَّ عِبَادِیْ: بے شک (یہ) میرے بندے ہیں

لَیْسَ لَكَ: نہیں ہے تیرے لیے

عَلَیْهِمْ: ان پر

سُلْطٰنٌ: کوئی اختیار

اِلَّا مَنِ: سوائے اس کے جس نے

اتَّبَعَكَ: پیروی کی تیری

مِنَ الْغٰوِیْنَ: گمراہ ہونے والوں میں سے

وَاِنَّ جَهَنَّمَ: اور بے شک جہنم

لَمَوْعِدُهُمْ: یقیناً ان کے وعدے کی جگہ ہے

اَجْمَعِیْنَ: سب کے سب کی

لَهَا: اس کے لیے

سَبْعَةُ اَبْوَابٍ: سات دروازے ہیں

لِكُلِّ بَابٍ: ہر دروازے کے لیے

مِّنْهُمْ: ان (گمراہوں) میں سے

جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ: ایک تقسیم کیا ہوا حصہ ہے

نوٹ ۱: شیطان نے اپنے نوٹس (آیت ۳۹) سے ان بندوں کو مستثنیٰ کیا جنہیں اللہ اپنے لیے خالص فرما لے (آیت ۴۰)۔ اس سے یہ غلط فہمی مترشح ہو رہی تھی کہ شاید اللہ تعالیٰ بغیر کسی معقول وجہ کے جس کو چاہے گا خالص کرے گا اور وہ شیطان کی دسترس سے بچ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر بات صاف کر دی کہ جو خود بہکا ہوا ہوگا

وہی تیری پیروی کرے گا (آیت ۴۱)۔ بالفاظِ دیگر جو بہکا ہوا نہ ہوگا وہ تیری پیروی نہ کرے گا اور وہی ہمارا وہ مخصوص بندہ ہوگا جسے ہم خالص اپنا کرلیں گے۔ تجھے صرف فریب دینے کا اختیار دیا جارہا ہے' ان پر اقتدار نہیں دیا جارہا کہ تو ہاتھ پکڑ کر انہیں زبردستی اپنی راہ پر کھینچ لے جائے۔ (تفہیم القرآن)

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مخصوص اور منتخب بندوں پر شیطانی فریب کا اثر نہیں ہوتا' مگر اسی واقعہ میں آدمؑ اور بی بی حوا پر اس کا فریب چل گیا۔ اسی طرح صحابہ کرام ؓ کے بارے میں آلِ عمران: ۱۵۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر بھی شیطان کا فریب ایک موقع پر چل گیا۔ اس لیے آیت مذکورہ میں اللہ کے مخصوص بندوں پر شیطان کا تسلط نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے قلوب وعقول پر شیطان کا ایسا تسلط نہیں ہوتا کہ وہ اپنی غلطی پر کسی وقت متنبہ ہی نہ ہوں' جس کی وجہ سے ان کو توبہ نصیب نہ ہو۔ اور مذکورہ واقعات اس کے منافی نہیں' کیونکہ آدمؑ اور بی بی حوا نے توبہ کی اور یہ توبہ قبول ہوئی۔ اسی طرح صحابہ کرامؓ نے بھی توبہ کی اور انہیں معاف کردیا گیا۔ (معارف القرآن)

نوٹ ۲: جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ کے الفاظ سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ جہنم کے مختلف دروازوں سے داخل ہونے والوں کے درمیان ایک خاص نوعیت کی درجہ بندی ہوگی۔ اس درجہ بندی کی بنیاد کس چیز پر ہوگی' اس باب میں کوئی قطعی بات کہنا' جبکہ خود قرآن میں اس کی کوئی تصریح نہیں ہے' مشکل ہے۔ لیکن ذہن بار بار اس طرف جاتا ہے کہ قرآن نے جن چیزوں کا اصولی مہلکات کی حیثیت سے ذکر کیا ہے' وہ اگر شمار کی جائیں تو وہ سات عنوانات کے تحت آتی ہیں اور وہ یہ ہیں: (۱) شرک (۲) قطع رحم (۳) قتل (۴) زنا (۵) جھوٹی شہادت (۶) کمزوروں پر ظلم (۷) بغی (یعنی بغاوت)۔ (تدبّرِ قرآن) ❁❁❁

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

- ☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
- ☆ بانیٔ تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
- ☆ تلاوتِ قرآن' دروسِ قرآن' دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
- ☆ صحیح بخاری' صحیح مسلم' موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
- ☆ میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
- ☆ اردو اور انگریزی کتابیں
- ☆ آڈیو/ویڈیو کیسٹس/سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

رسالہ ’’ظہور العدم بنور القدم‘‘

از: مولانا اشرف علی تھانویؒ

تسہیل و تعلیق: مکرم محمود

جملہ موجودات کی اصل واحد تک پہنچنا یا وحدت و کثرت کے باہمی ربط کو تلاش کرنا فلسفہ و حکمت اور مابعد الطبیعیات کے قدیم اور اساسی مسائل میں سے ہے۔ اس مسئلہ اور اس سے متعلقہ مسائل میں اگر کوئی رائے‘ کوئی تناظر اور کوئی نظامِ فکر کشف و ذوق وصفائی باطن اور عقل کے ساتھ ساتھ قرآن و سُنّت کے اشارات کے تابع رہتے ہوئے پیش کیا جائے تو اسے نظری تصوف کہا جاتا ہے۔ اگر صرف کشف و ذوق اور صفائی باطن پر اساس ہو تو اشراقی فلسفہ ہے۔ اگر صرف عقلی نظر و فکر اور تخیل کی مدد سے ہو تو فلسفہ۔ مسئلہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود نظری تصوّف ہی کا ایک بنیادی مسئلہ ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ کا رسالہ ’’ظہور العدم بنور القدم‘‘ اس مسئلہ پر ایک نہایت ہی جامع و مانع رسالہ ہے جو اس مسئلے کی توضیح و تنقیح نہایت ہی منفرد و مکمل انداز سے کرتا ہے۔ اس موضوع پر بہت سے رسائل راقم کے زیرِ مطالعہ رہے ہیں لیکن ’’ظہور العدم بنور القدم‘‘ سے بہتر ہنوز نظروں سے نہیں گزرا۔ اس رسالہ کو حضرت مجدد الف ثانی صاحبؒ کے ایک مکتوب (جلد دوم‘ مکتوب اوّل) کی شرح و وضاحت بھی کہا جا سکتا ہے‘ جیسا کہ حضرت تھانویؒ کی اپنی عبارت سے بھی واضح ہو جائے گا۔ رسالے کے عنوان کے ساتھ ہی اس کو ملّا جامیؒ کی طرف منسوب ایک شعر: ؎

کل مافی الکون وھمٌ او خیال
او عکوسٌ فی المرایا او ظلال

(کائنات میں جو کچھ ہے وہ یا تو وہم و خیال ہے یا آئینہ میں بننے والے عکوس یا سائے ہیں)

کی شرح بھی قرار دیا گیا ہے۔ حضرت تھانویؒ نے اس مسئلے کو بہت سے مقامات پر بیان کیا ہے مگر ہر جگہ موقع محل اور مخاطب کی رعایت کی گئی ہے کہ ہر جگہ عارفانہ عمق‘ فلسفیانہ گہرائی اور کلامیانہ دقت کے ساتھ اس کا بیان فتنہ اور غلط فہمی کا سبب بن سکتا تھا۔ لہٰذا نفسِ مسئلہ کو نظری سطح پر فکری و فلسفیانہ عمق کے ساتھ معروضی انداز میں بیان کرنا ہمیں اسی رسالہ میں نظر آتا ہے۔ آغاز میں اس رسالہ کی زیادہ تشہیر و اشاعت نہیں کی گئی اور یہ ایک حلقہ احباب باذوق تک محدود رہا۔ بعد میں حضرت تھانوی کے آخری ایام میں جو مجموعہ رسائل ’’بوادر النوادر‘‘ کے نام سے چھپا اس میں اسے شامل کر دیا گیا۔

اس رسالے کی عبارت کافی مشکل ہے۔ عربی عبارات اور کلامی و عرفانی اصطلاحات کی کثرت ہے‘ اس لیے اپنے ایک استاد کے کہنے پر اس کی تسہیل کی کوشش کی گئی ہے۔ عبارت میں اصل متن کے مفہوم کو ذرا آسان الفاظ میں بیان کرنے کی وجہ سے اکثر جگہوں پر تسہیل شدہ عبارت اصل متن سے تھوڑی طویل ہوگئی ہے۔ عربی عبارات کا صرف ترجمہ دیا گیا ہے۔ شرح و وضاحت اور معنوی مشکلات کو حل کرنے کی جہاں حاجت تھی تو وہاں بریکٹ لگا کر بات کی گئی ہے۔

رسالہ مع التسہیل

احقر اس مدّعا کو ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ مسئلہ وحدت الوجود والشہود کے مسئلہ میں افراط وتفریط کے دو طرزِ عمل ہمیں نظر آتے ہیں۔ ایک طرف قائلین ہیں جو حدود کی پروا کیے بغیر بہت کچھ کہے چلے جاتے ہیں اور دوسری طرف منکرین و ناقدین ہیں جو حقیقت کو نہ جاننے کی وجہ سے بدگمانی کا شکار ہوتے ہیں۔ اس افراط وتفریط کی دو وجوہات ہیں:

۱) اس کو صرف کشفی مسئلہ سمجھنا

۲) اس مسئلہ کو ان اہلِ کشف کے کلام سے سمجھنا جو یا تو اپنے احوال سے مغلوب ہیں یا بات کرنے پر صحیح قدرت نہیں رکھتے۔

ظاہر ہے ان وجوہات سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ پھر آپ جن صاحب کے کلام سے اس مسئلے کو سمجھ رہے ہیں اگر ان سے حسنِ ظن ہے تو مسئلہ کا ایک غیر حدود آشنا تصور پیدا ہو جائے گا اور اگر سوءِ ظن ہے تو صاحبِ کلام سے بدگمانی لازماً پیدا ہوگی۔ ان ہی مفاسد کی اصلاح کے لیے ایسے علماء جو اہلِ طریقت وتصوف کے معتقد ہیں اور ایسے عارفین جو اصحابِ تحقیق بھی ہیں‘ ہمیشہ کوشش کرتے رہے ہیں۔ علماء کی کوشش کا نتیجہ تو یہ تھا کہ وحدت الوجود کی تاویل وتعبیر کر کے اس کو وحدت الشہود کی طرف لوٹایا جائے اور ان میں باہمی اختلاف کو صرف لفظی قرار دیا جائے (یعنی حقیقت میں دونوں ایک ہیں‘ صرف الفاظ مختلف ہیں)‘ کیونکہ وحدت الوجود پر تنقید و ملامت زیادہ ہے جبکہ وحدت الشہود کو صوفیاء کے مخالف گروہوں میں بھی قبول حاصل ہے۔ عارفین کی تحقیق کا حاصل یہ تھا کہ اس غلط فہمی کی بنیاد ہی کو ڈھا دیا جائے‘ وہی بنیاد جس کو دو وجوہات کی صورت میں پہلے بیان کیا گیا ہے۔ عارفین اصحابِ تحقیق (جو کشف وعرفان کے ساتھ معقولات اور کلام پر بھی دسترس رکھتے ہیں) نے واضح فرمادیا کہ دونوں مسئلے علمی اور کلامی ہیں اور ان میں اختلاف حقیقی ہے۔ ان کے علمی اور کلامی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان مسائل کی اصل اور غایت حادث اور قدیم کے مابین ربط کی تحقیق ہے اور اس کا علمی اور کلامی مسئلہ ہونا تو معلوم ہے۔ البتہ یہ ان علمی مسائل میں سے نہیں جو خالص عقلی ہوتے ہیں (خالص عقلی مسائل وہ ہوتے ہیں جہاں عقل کسی شے کے ہونے یا نہ ہونے پر کوئی قطعی حکم لگائے)۔

اصولی کلامی مسائل دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک محض عقلی جہاں عقل کسی موقف کو لازماً ثابت کرتی ہے۔ مثلاً اس کائنات کے لیے ایک خالق وصانع کا وجود اور عالم کا حادث ہونا وغیرہ۔ دوسرے‘ عقلی غیر محض کہ یہاں

عقل صرف یہ بتاتی ہے کہ یہ بات یا موقف ممکن ہے لیکن ثبوت کے لیے نقلی دلیل کی ضرورت ہے۔ جیسے رویتِ باری تعالیٰ کا مسئلہ ہے کہ عقل اس کو ممکن قرار دیتی ہے اور جو فرقے اسے ناممکن و ممتنع قرار دیتے ہیں ان کی نفی کرتی ہے' اگرچہ عقل رویتِ باری تعالیٰ کی حقیقت کو کبھی نہیں جان سکتی۔ تاہم عقل کا کسی بات کو ممکن قرار دینا یا اس کو قطعی طور پر ثابت کر دینا اس بات پر موقوف نہیں ہے کہ وہ اس کی حقیقت کو بھی جان لے (کیونکہ کسی شے کے وجود کا علم درجہ امکان میں یا قطعیت کے ساتھ ہونا ایک اور بات ہے اور اس کی حقیقت کا علم ایک دوسری بات)۔

یہ تو خیر علمِ قدیم (یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علم) کا مسئلہ ہے' مخلوق کے علم کی کنہہ بھی آج تک معلوم نہ ہو سکی۔ کوئی اسے مقولہ اضافت سے متعلق کہتا ہے' کوئی مقولہ انفعال سے اور کوئی مقولہ کیف سے۔ [ممکنات کو مقولاتِ عشرہ (Ten categories) میں منقسم کیا جاتا ہے' ایک جوہر کا اور نو عرض کے۔ جوہر وہ ممکن ہوتا ہے جو اپنی ذات کے ساتھ قائم ہو جبکہ عرض بغیر کسی ذات کے نہیں ہو سکتی۔ مثلاً صفات اعراض ہیں اور وہ بغیر ذات کے نہیں ہوتیں۔ مقولہ اضافت' انفعال اور کیف عرض ہی کے تین مقولات ہیں۔ کیف اس عرض کو کہتے ہیں جو اپنی ذات میں نہ تقسیم کو قبول کرتا ہے اور نہ نسبت کو' جیسے سواد (کالا پن)' بیاض (سفیدی) جو مادی اجسام کے ساتھ قائم ہوتے ہیں اور علم وقدرت وغیرہ جو مجردات کے ساتھ قائم ہوتے ہیں۔ انفعال میں تاثر یعنی اثر قبول کرنے کی طرف اشارہ ہے اور مقولہ اضافت میں نسبت کی طرف۔]

اقسامِ علم میں سے جو قسم سب سے زیادہ ظاہر اور نمایاں ہے اس کی حقیقت تک واضح نہیں ہوئی (غالباً مشاہدہ کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ اگلی عبارت سے معلوم ہو رہا ہے)۔ خود دیکھنے کی حقیقت کیا ہے' اس میں ہی اختلاف ہے لیکن ان کے ہونے پر تو تمام عقلاء متفق ہیں۔ پس جب کسی بات کو ثابت کرنا اس کی حقیقت جاننے پر منحصر نہیں تو کسی شے کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ ممکن ہے' بالکل بھی اس کی حقیقت و ماہیت جاننے پر منحصر نہ ہوگا۔ رویتِ باری تعالیٰ کا مسئلہ بھی ایسا ہی ہے کہ امکان اس کا عقل کے ذریعے معلوم ہوتا ہے اور ثابت کرنے میں نقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ عقلی کلامی مسائل کی ایک قسم ایسی بھی ہوتی ہے۔ وحدت الوجود والشہود کا مسئلہ بھی اسی قسم میں شامل ہے کیونکہ اس میں کشف کا عمل دخل ہے (یعنی یہ مسئلہ خالص عقلی نہیں بلکہ عقلی غیر محض ہے)۔

علم کلام کی کتابوں میں اس مسئلہ کے نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ متکلمین نے صرف ان مسائل کو لیا ہے جو قطعی ہوں۔ البتہ کچھ ظنی مسائل بھی اسی کے ذیل میں ضرورت کے تحت آ گئے ہیں۔ جیسے ''جزء لا یتجزی'' کا مسئلہ (ایسا جز جس کا مزید تجزیہ نہ ہو سکے یعنی اس کو مزید تقسیم نہ کیا جا سکے) جو حدوثِ عالم کے مسئلے کے ضمن میں آ گیا ہے کہ اس سے جسمیت ثابت ہوتی ہے اور جسم حادث ہوتا ہے۔ جسم کے حدوث پر دلائل کتب کلام میں موجود ہیں۔ متکلمین کے ہاں خاص طور پر قطعی مسائل ہی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ مسئلے نہ تو قطعی ہیں اور نہ یہ اس وقت ظاہر ہوئے جب علم کلام کی تدوین ہو رہی تھی۔ ان عوارض کی وجہ سے انہوں نے ان مسائل کا ذکر نہیں کیا۔ یہ ذکر نہ کرنا ہمارے اس دعوے کو کہ یہ مسائل اصولی اور کلامی کی دوسری قسم (عقلی غیر خالص) سے ہیں' باطل نہیں کرتا۔

رہی یہ بات کہ یہ مسائل قسم ثانی میں سے کس طرح ہیں حالانکہ متکلمین نے وجود کے مسئلے کو قسم اول (عقلی

محض رخالص) میں ذکر کیا ہے‘ تو ممکنات وحوادث کے لیے وجود کو ثابت کرنے کی کیفیت متکلمین کے نزدیک عقلی محض ہے جبکہ صوفیاء کے نزدیک باہمی اختلافات کے باوجود عقلی غیر محض کہ اس کا امکان عقل سے ثابت ہوتا ہے اور اس کا ہونا کشف سے (یعنی اس مسئلہ میں صوفیاء اور متکلمین کے درمیان بنیادی اختلاف ہے کہ متکلمین کے نزدیک موجودات کا وجود بدیہی ہے لیکن صوفیاء کے نزدیک ایسا نہیں ہے۔ اس نزاع کی تفہیم میں اس تفریق سے سہولت ہو جائے گی کہ متکلمین وجود کے مصدری معنی لیتے ہیں یعنی ’’ہونا‘‘ جبکہ صوفیاء وجود سے مراد ’’ما بہ الموجودیت‘‘ لیتے ہیں یعنی وجود بمعنی وہ حقیقت جس کی بنیاد پر موجودات موجود ہیں)۔ تو وجود کا مسئلہ متکلمین کے نزدیک پہلی قسم سے ہے جبکہ صوفیاء کے نزدیک دوسری قسم سے۔

متکلمین کے ہاں جو دوسری قسم کے مسائل ہیں ان میں اور اس میں اتنا فرق ہے کہ انہوں نے عقل کے ساتھ نقل میں صرف نصوصِ قرآن وسُنّت کو لیا ہے مگر صوفیاء نے نصوص کے ساتھ کشف کو بھی۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ مسئلہ عقلی نہ رہے جس طرح رویتِ باری تعالیٰ کا مسئلہ اس کے باوجود کہ اس کا ثبوت نص سے ہوتا ہے‘ عقلی ہے (عقلی غیر محض‘ دوسری قسم)۔ زیادہ سے زیادہ اس بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ یہ مسئلہ کشف سے سند پکڑتا ہے اس لیے ظنی ہے اور ظنیات میں بھی اس کا درجہ نہایت کمتر ہے‘ کیونکہ کشف حجیت کے درجات میں سے کسی درجے پر بھی فائز نہیں ہو سکتا (یہاں کشف کے حوالے سے اصولی حکم حضرت تھانویؒ نے بیان فرمادیا ہے) لیکن ظنی میں چاہے وہ کسی بھی درجے کا ہو احتمال صحت کا بہر حال رکھتا ہے۔ اس لیے اس مسئلہ کو قطعی طور پر باطل قرار دینا یا اس مسئلہ کے ماننے والوں کو حتمی طور پر گمراہ قرار دینا غلو کا اظہار ہوگا۔ یہ اولیاء اللہ سے عداوت کے زمرے میں آئے گا جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے جنگ کے اعلان کی وعید ایک صحیح روایت میں آئی ہے۔

علماءِ ظاہر (مراد متکلمین ہیں جو کشف وذوق سے اتنی مناسبت نہیں رکھتے) نے ممکنات وحوادث کے وجود کی جو کیفیت بیان کی ہے وہ قطعی نہیں ہے۔ اگر وہ قطعی ہوتی تو صوفیاء کے موقف کو باطل قرار دینا درست ہوتا لیکن چونکہ ایسا نہیں ہے اس لیے یہ مسئلہ سب کے نزدیک ظنی ہی رہا۔ البتہ یہ ظنیت اہلِ ظاہر کے نزدیک پہلی قسم سے ہے اور اہلِ باطن کے نزدیک دوسری قسم سے (اہلِ ظاہر کے نزدیک پہلی قسم میں ظنیت سے مراد غالباً یہ ہے کہ عقل وہاں لزوم کا حکم تو نقل یا کشف کی مدد کے بغیر کرتی ہے لیکن جن دلائل کی بنیاد پر کرتی ہے وہ قطعی نہیں ہوتے۔ واللہ اعلم!) بہر حال عارفین اہلِ تحقیق نے ان غلطیوں کی اصلاح اس طرح فرمائی کہ ان دونوں مسئلوں (وحدت الوجود والشہود) کا اپنے بیان سے کلامی ہونا ظاہر فرمادیا۔

ان تمام بیانات میں سب سے واضح اور قریبی بیان حضرت مجدد الفِ ثانیؒ کا ہے جسے انہوں نے اپنے مکتوبات میں ظاہر فرمایا ہے۔ چونکہ اس میں بھی اس فن (نظری تصوف‘ جس میں حقائق سے عقل وکشف کی مدد سے بحث کی جاتی ہے) کی بہت سی اصطلاحات آگئی ہیں اس لیے وہ بیان مشکل ہے اور اہلِ ظاہر کے لیے اسے سمجھنا آسان نہیں ہے۔ اس لیے میرے دل میں یہ آیا کہ اس فائدے کو عام اور مکمل کرنے کے لیے اس مسئلے کا خلاصہ

کر دیا جائے جس کا اصل ماخذ مجدد صاحبؒ کے مکتوبات کی جلد دوم کا پہلا مکتوب ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ کو درسی اصطلاحات میں لکھ دوں تاکہ اس سے ایسی اجنبیت نہ ہو جو ضرر کا باعث ہو۔ اس کو بھی انہی مسائل کی طرح لیا جائے جن کے بارے میں نقل خاموش ہے جبکہ عقل ان کی صحت کا احتمال اجمالی درجے میں رکھتی ہے اور تفصیلی درجے میں اس کی حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتی۔ احتیاط تو اس میں ہے کہ چونکہ اس مسئلے کی بنیاد کشف پر بھی ہے اس لیے اس کو اس سے بھی کم درجے میں قرار دیا جائے لیکن اس سے اتنا تو ہوگا کہ اولیاء کے حق میں بدزبانی و بدگمانی سے تو بچیں گے۔ اللہ ہی بچانے والا ہے ہر نا سمجھی اور گمراہی سے۔

اصل مقصود کا بیان

تمام اہلِ حق بلکہ تمام آسمانی ادیان کی طرف نسبت رکھنے والے جو عالم کو حادث بالذات اور حادث بالزمان مانتے ہیں (یہ تقسیم متکلمین کی نہیں بلکہ حکماء کی ہے۔ متکلمین جب کسی شے کو حادث کہتے ہیں تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ شے اپنے وجود کے لیے علت کی محتاج بھی ہے اور مسبوق بالعدم بھی ہے یعنی اپنے ہونے سے پہلے وہ زمانی طور پر معدوم تھی۔ حکماء ان دو مطالب کو الگ الگ بیان کرتے ہیں۔ حادث بالذات ان کے ہاں وہ ہے جو اپنی ذات کے لیے علت کا محتاج تو ہے مگر غیر مسبوق بالعدم ہے اور حادث بالزمان مسبوق بالعدم ہوتا ہے۔ حضرت تھانوی نے دونوں کو الگ الگ اس لیے بیان کیا کہ بات واضح ہو جائے کہ عام طور پر تمام آسمانی ادیان کی طرف نسبت رکھنے والے عالم کو ان دونوں معانی میں حادث مانتے ہیں۔ ہاں کچھ منحرف فرقوں کی الگ بات ہے) کہ عالَم پہلے مکمل طور پر معدوم تھا' پھر اللہ تعالیٰ کی تخلیق و ایجاد سے موجود ہوا۔ البتہ اس موجود ہونے یعنی عالَم کے وجود کے ساتھ اتصاف و تعلق کی کیفیت میں اختلاف ہے۔ اس بارے میں چار اقوال و آراء ہیں۔ ایک علماءِ ظاہر کا' دوسرا بعض حکمائے اسلام کا۔ تیسرا وحدت الوجود کے قائلین کا جن کے مشہور رئیس شیخ اکبر ابنِ عربیؒ ہیں۔ اجمال کے ساتھ اس دعویٰ کا ظہور پہلے بھی کچھ بزرگوں سے ہوا ہے جیسے بایزید بسطامیؒ کا ''انا الحق وسبحانی'' کہنے کا واقع مشہور ہے لیکن اس دعویٰ میں اجمال بھی تھا اور ابہام بھی تھا۔ مکمل تفصیل سب سے پہلے شیخ اکبر ابنِ عربیؒ کے ہاں ہی ظاہر ہوئی ہے۔ چوتھا قول وحدت الشہود کے قائلین کا ہے جن کے امام حضرت مجدد الف ثانیؒ ہیں۔

حضرت مجدد صاحبؒ سے پہلے دو ہی اقوال معروف تھے۔ اکثریت پہلے قول پر تھی جو کہ علمائے ظاہر اور متکلمین کا تھا اور اقلیت تیسرے قول (وحدت الوجود / شیخ ابنِ عربیؒ) کی قائل تھی۔ اس تیسرے قول میں نہایت احتیاط کی ضرورت تھی (مگر عوام اور شاعروں کے ہتھے چڑھنے کی بنا پر) اس میں بگاڑ پیدا ہو گیا اور اس نے کفر و زندقہ کی صورت اختیار کر لی۔ علماء کو چونکہ یہ لوگ کشف سے خالی اور ناواقف سمجھتے تھے اس لیے ان کے قول کو توجہ کے لائق نہ سمجھتے اور نہ مانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اصلاح کا ذریعہ حضرت مجدد صاحبؒ کو بنایا اور کشف کے ذریعے ان پر اس مسئلے کی ایک خاص کیفیت ظاہر ہوئی جس کو انہوں نے بیان کیا۔ چونکہ ان کا صوفی اور صاحبِ کشف ہونا سب کے ہاں مسلّم تھا' اس لیے ان کی اتنی زیادہ مخالفت نہیں کی گئی۔ اس طرح اس مسئلے میں کفر و زندقہ کی جو

علامات ظاہر ہوگئی تھیں ان کی اصلاح ہوگئی۔ اگرچہ علماءِ ظاہر مجدد صاحبؒ کی بھی کامل موافقت نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے قول کو بھی وہ اپنے قول سے ایک گونہ فاصلے پر پاتے ہیں۔ دونوں فریقین میں جو محتاط لوگ ہیں وہ اسی اصول پر عمل کرتے ہیں کہ جس چیز کو اللہ نے مبہم رکھا ہے اس کو مبہم ہی رہنے دو۔ جن حضرات پر کشف سے کچھ باتیں کھل جاتی ہیں تو گویا ان کو اس مسئلے میں ابہام نہیں رہتا تو وہ بھی اس اصول کو ترک کرنے والے شمار نہ ہوں گے: ﴿ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ۭ ﴾ (الاسراء: ۸۴) ''ہر کوئی اپنے شاکلہ کے اعتبار سے عمل کرتا ہے۔''

اب عالم کے وجود کے ساتھ اتصاف کی ان چاروں کیفیتوں کا مختصر بیان کرتا ہوں۔ آسانی اور وضاحت کے لیے شروع میں ایک مثال بیان کرتا ہوں جس سے وجود سے اتصاف کی کیفیتوں کے بارے میں ان سب اقوال کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ وہ مثال آئینہ کی ہے جو سورج کے بالکل سامنے ہے۔ یہ بے قلعی شدہ آئینہ ہے یعنی شیشہ ہے اور اس کو سورج کے سامنے رکھنے سے چار کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ نورِ آفتاب سے منور ہو جاتا ہے۔ یہ نور جس سے آئینہ متصف ہو کر منور ہو چکا ہے‘ نورِ آفتاب سے الگ تو نہیں ہے۔ یہ ایک ہی نور ہے جو آفتاب کی ذاتی صفت اور آئینہ کی عرضی صفت ہے (ذاتی صفت وہ ہوتی ہے جو ذات کا اقتضاء ہو یعنی ذات میں وہ صفت لازمی پائی جانی چاہیے اور عرضی صفت وہ ہوتی ہے جو کسی دوسرے کے ذریعے حاصل ہوئی ہو اور ذات کا اقتضاء نہ ہو) اور اسی وجہ سے ایسا ہوتا ہے کہ اگر آئینہ کو آفتاب کے سامنے سے ہٹا لیا جائے تو وہ منور نہیں رہتا۔ دوسری کیفیت یہ ہے کہ آئینہ آفتاب کی حرارت سے گرم ہو جاتا ہے۔ یہ حرارت جو اب آئینہ کو حاصل ہوگئی‘ آفتاب کی حرارت سے الگ ہے اگرچہ یہ آفتاب ہی سے حاصل ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے ایسا ہوتا ہے کہ اگر آفتاب کے سامنے سے آئینہ کو ہٹا لیا جائے تب بھی وہ گرم رہتا ہے۔ تیسری کیفیت یہ ہے کہ آفتاب کی گول ٹکیا آئینہ کے اندر منعکس نظر آتی ہے اور دلیل سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس میں جو نظر آ رہا ہے وہ آفتاب کا عین نہیں ہے‘ جیسا کہ ظاہر ہے‘ اور نہ اس کا سایہ اور مثال ہے بلکہ وہم و خیال ہے۔ میبذی کے حاشیہ (''ہدایت الحکمہ'' حکمت و فلسفے کی مشہور کتاب ہے۔ اس کے مصنف اثیر الدین ابہری ہیں‘ جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ امام رازی کے شاگرد تھے۔ مُلّا میبذی نے اس پر حاشیہ لکھا ہے۔ یہ حاشیہ ابھی بھی درس نظامی کے نصاب میں شامل ہے) میں بھی اس کی تشریح کی گئی ہے کہ آئینہ میں جو خیالی صورت نظر آتی ہے وہ محض وہم ہے اور وہم اس کو اس لیے فرض کر لیتا ہے کہ اس کو ایک گونہ استقامت حاصل ہوتی ہے اور وہ صورت کے سامنے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر دیکھنے والا اپنی آنکھ بند کرے تو پھر آئینے کے اندر کچھ بھی نہیں رہتا۔ اگر اس میں کوئی صورت ہوتی تو آنکھ بند کرنے سے معدوم کیوں ہوتی؟ دراصل جب آئینہ پر آنکھ کی شعاع پڑتی ہے تو آئینہ سے ٹکرا کر سورج کی طرف لوٹتی ہے اور اس طرح سے خود سورج ہی نظر آ رہا ہوتا ہے مگر وہم یوں ہوتا ہے کہ آئینہ کے اندر کوئی چیز ہے‘ ورنہ حقیقت میں کچھ بھی نہیں ہے۔ جب حقیقت یہ ہے تو ظاہر ہے کہ آنکھ بند ہونے سے جب شعاع آئینہ پر نہ پڑے گی تو آفتاب کی طرف بھی نہ لوٹے گی (یہ دیکھنے کا پرانا تصور ہے۔ جدید سائنس اس کو اس طرح بیان نہیں کرتی مگر اس سے نفس مثال پر کوئی فرق نہیں پڑتا) اور آئینہ میں آفتاب کے

نظر آنے کا معیار اس بات پر تھا تو اب آفتاب کی صورت بھی آئینہ میں ظاہر نہ ہوگی۔ چوتھی صورت یہ ہے کہ اس آئینہ کا سایہ اس کے مقابلہ میں زمین یا دیوار وغیرہ پر پڑتا ہے‘ جس کا وجود نہ تو روشنی اور حرارت کی طرح واقعیت رکھتا ہے اور نہ جو عکس آفتاب کی ٹکیا کا آئینہ میں بن رہا تھا اس درجے میں غیر واقعی ہے بلکہ ان دونوں کے درمیان میں ہے۔ روشنی اور حرارت کے مقابلے میں تو ضعیف و کمزور اور غیر مستقل مگر آئینہ میں دکھائی دینے والے عکس کے مقابلے میں قوی و مضبوط اور مستقل۔ مثال یہاں مکمل ہوئی۔

پہلی کیفیت میں آئینہ کے نور کو سورج کے نور کا عین کہیں گے۔ (عین کہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کو ایک کہا جائے۔ ان کو ایک دوسرے سے الگ اور ممتاز نہ سمجھا جائے۔ عینیت من کل الوجوہ بھی ہوتی ہے یعنی ہر اعتبار سے عین ہونا اور عینیت من بعض الوجوہ بھی ہوتی ہے یعنی بعض اعتبارات سے عین ہونا۔ عینیت من کل الوجوہ میں دوئی کا تصوّر ہی محال ہے۔ جہاں دوئی کا تصوّر ممکن ہے وہاں عینیت من بعض الوجوہ ہوتی ہے۔ یہاں بھی عینیت سے مراد من بعض الوجوہ ہے۔ واللہ اعلم!) دوسری کیفیت میں آئینہ کی گرمی کو سورج کی گرمی کا غیر کہیں گے اور اسے آئینہ کی وہ صفت مانیں گے جو بعد میں اس کو حاصل ہوگئی۔ تیسری کیفیت میں جو عکس آئینہ کے اندر سورج کا نظر آرہا ہے اس کو محض خیالی کہیں گے اور اس کی حقیقت سے واقفیت کے بعد اس کو ایک اعتبار سے معدومِ محض کہنا بھی صحیح ہوگا اور ایک اعتبار سے عین شمس کہنا بھی صحیح ہوگا۔ چوتھی کیفیت میں جو سایہ وجود میں آرہا ہے اس کو آئینہ کی صورت اور مثال کہیں گے۔ یہ سب احکامات بالکل واضح اور ظاہر ہیں۔ یہ مثال اور اس کی کیفیات کے مختلف احکام جب سمجھ میں آگئے ہیں تو اب اللہ تعالیٰ کی مدد اور توفیق سے اصل مقصود بیان کرتا ہوں۔

علماءِ ظاہر کہتے ہیں کہ تمام عالم پہلے معدوم تھا‘ اللہ تعالیٰ نے ان معدومات کو اپنے اپنے وقت پر (وقت و زمان خود حادث ہے) اپنی قدرت اور ارادہ سے وجودِ حادث کے ساتھ متصف کر دیا (اس اتصاف سے وہ معدومات موجودات ہو گئے)۔ ان موجودات میں جو استقلال کا مشاہدہ ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کو اپنے پیدا ہونے اور باقی رہنے کے لیے موجد و محدث یعنی پیدا کرنے والے کی حاجت نہیں ہے کہ یہ تو واجب کی خصوصیات میں سے ہے (واجب کو کسی دوسرے کی احتیاج نہیں ہوتی‘ وہ اپنے آپ سے ہوتا ہے) بلکہ اس استقلال سے مراد یہ ہے کہ یہ حادث وجود نہ کسی موجود کا عین ہے اور نہ اس کا ظل (یعنی وہ فی الحقیقت موجود ہے‘ کسی حقیقی وجود کا عین یا اس کا سایہ نہیں ہے)۔ پس اس وجود کے ساتھ اتصاف کے نتیجے میں وہ معدومات حقیقی طور پر موجود ہو گئے۔ یہ وجود واجب اور ممکن دونوں کو حاصل تو ہے مگر تشکیک کے ساتھ۔ واجب پر اولیت اور اولویت کے ساتھ اور ممکن کے لیے بغیر اولیت اور اولویت کے۔ [اس رائے کے مطابق وجود کلی ہے۔ کلی اس تصوّرِ مفہوم کو کہتے ہیں کہ جو شرکت غیر سے مانع نہ ہو۔ یعنی وہ مفہوم جو بہت سے افراد و جزئیات کو اپنے احاطہ میں لے سکے۔ مثلاً تصوّرِ انسان ایک کلی ہے جو بہت سے افراد کا احاطہ کرتا ہے۔ زید بھی انسان ہے‘ بکر بھی انسان ہے‘ علی بھی انسان ہے۔ مگر زید جزئی ہے۔ یہ زید جو ہمارے سامنے ہے‘ ایک خاص تشخص کے ساتھ ہے۔ یہ اپنے مفہوم میں کسی دوسرے کو شریک نہیں کرتا۔ لیکن انسان یا انسانیت کا تعلق زید‘ بکر‘

احمد وغیرہ سے برابر کی سطح پر ہے۔ زید بھی اتنا ہی انسان ہے جتنا کہ بکر۔ تو انسان کی کلی کو ہم کہیں گے کہ یہ کلی مشکک نہیں ہے بلکہ کلی متواطی ہے۔ اب وجود کی کلی کو دیکھیے۔ مفہومِ وجود کا نفسِ تصورّ شرکتِ غیر کا انکار نہیں کرتا۔ واجب بھی موجود ہے، ممکن بھی موجود ہے لیکن کیا ان کو ایک جیسا وجود حاصل ہے؟ یقیناً نہیں! تو یہاں ہم کہیں گے کہ وجود واجب اور ممکن کو حاصل تو ہے مگر تشکیک کے ساتھ یعنی ان کو برابر کے درجے کا یا ایک ہی سطح کا وجود حاصل نہیں ہے۔ واجب کے لیے وجود پہلے (اوّلیت) بھی ہے اور اولیٰ (اولویت) بھی ہے جبکہ ممکن کے لیے نہ پہلے ہے نہ اولیٰ ہے۔ ثانوی درجے پر ہے، غیر حقیقی اور غیر ذاتی ہے۔ اوّلیت کا معنی یہ ہے کہ بعض افراد کا اتصاف کلی کے ساتھ علت بنے، باقی افراد کے اس کلی کے ساتھ اتصاف کے لیے۔ جیسے ذات باری تعالیٰ کا اتصاف وجود کے ساتھ علت ہے باقی موجودات کے وجود کے ساتھ اتصاف کی) پس علمائے ظاہر کے نزدیک ممکنات وحوادث کا وجود کے ساتھ تعلق ایسا ہی ہے جیسے اوپر دی گئی مثال میں آئینہ کے گرمی کے ساتھ متصف ہوجانا کہ یہ اتصاف ہوتا تو حقیقی ہے مگر سورج کی گرمی کا محتاج ہے۔ اور اس کا غیر بھی ہے کہ اس سے بالکل الگ اپنا وجود رکھتا ہے۔ ان کے نزدیک وجود بھی کلی ہے اور موجود بھی کلی۔ (کلی کا مفہوم ہم پہلے سمجھ آئے ہیں۔ علماءِ ظاہر کہتے ہیں کہ وجود اور موجودگی دونوں ایسے کلی تصورات ہیں جو اپنے مفہوم میں بہت سے افراد کو شریک کرتے ہیں۔ یہ کلی تصورات ومفہومات انہی افراد ہی سے اخذ کیے گئے ہیں۔ وجود اور موجود کے تصوّرات موجودات ہی سے منتزع (derive) ہوئے ہیں۔ بس یہ ہے کہ ممکن وواجب کو نہ وجود ایک درجے کا حاصل ہے اور نہ ان کی موجودگی ایک درجے کی ہے۔ ایک کا وجود ذاتی اور حقیقی ہے اور دوسرے کا عرضی اور غیر حقیقی۔]

بعض حکمائے اسلام (مسلمان فلسفی) یہ کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے ممکنات کی ماہیات (ماہیت سے مراد حقیقت ہوتی ہے۔ یعنی وہ جس کی بنیاد پر وہ شے دوسری اشیاء سے امتیاز حاصل کرتی ہے۔ ماہیت اور وجود کے مباحث مابعد الطبیعیات کے بنیادی مباحث میں سے ہیں کہ ان میں عینیت ہے یا غیریت، اصالت وجود کو حاصل ہے یا ماہیت کو وغیرہ) کو وجود دینا چاہا تو ان کو اپنے وجود کے ساتھ (وجودِ باری تعالیٰ) جو اُس کی ذات کے ساتھ قائم ہے، ایک خاص نسبت وتعلق پیدا فرما دیا۔ اس نسبت وتعلق کی حقیقت معلوم نہیں۔ کوئی الگ سے وجود ان ماہیات کو حاصل نہیں ہوا، بس اس نسبت وتعلق کی وجہ سے وہ ماہیات وجود کے ساتھ متصف ہوگئیں۔ ان کے نزدیک ممکنات کا اتصاف وجود کے ساتھ ایسا ہے جیسے اوپر دی گئی مثال میں آئینہ جو روشنی سے متصف ہوا، وہ روشنی یا نور جزئی ہے اور حقیقی ہے جس کے ساتھ آفتاب بالذات موصوف ہے اور آئینہ بالعرض۔ (یعنی نور یا روشنی کے مفہوم میں یہاں اشتراک نہیں ہے بلکہ وہ ایک واحد خارجی حقیقت ہے جو کہ سورج کی تو ذاتی صفت ہے لیکن آئینہ کے لیے وہ عطائی صفت ہے۔ یعنی اس کو وہ دی گئی ہے، اس کی ذات کا اقتضاء نہیں ہے۔) بس نور جزئی حقیقی ہے اور منور کلی (یعنی نور کے مفہوم میں تو یہاں اشتراک ممکن نہیں ہے لیکن منور ایک ایسا مفہوم ہے جو بہت سے افراد کو شامل ہوسکتا ہے۔ مثلاً آئینہ بھی منور ہے اور آفتاب بھی۔ آفتاب اپنے ذاتی نور سے منور ہے اور آئینہ آفتاب کے نور سے۔ نور یہاں ایک ہی ہے۔) اس طرح یہ لوگ وجود کو جزئی حقیقی کہتے ہیں اور موجود کو کلی (یعنی وجود ایک حقیقت واحدہ ہے۔ اس سے نسبت رکھنے والے

موجودات کثیر ہو سکتے ہیں۔ یعنی موجود ایک کلی تصور ہے جس کے مفہوم میں ایک سے زائد افراد شامل ہو سکتے ہیں)۔اس کی حقیقت تو ان کو معلوم نہیں ہے مگر دلیل کی وجہ سے اس کے قائل ہو گئے۔ میبذی نے اس کو ''ھدایۃ الحکمۃ'' (اثیر الدین الابہری) کی ایک فصل جس کا عنوان ہے ''ممکنات واجب کے ساتھ وجود میں اشتراک نہیں رکھتی ہیں'' میں سب سے پہلے حکماء محققین کا مذہب بیان کیا ہے کہ ''وجود مطلق یعنی 'ہونا' طبعی نوع کی طرح نہیں ہے کہ وہ وجود پر جو عینِ ذات ہے اور ممکنات کے وجود پر صادق آئے بلکہ وہ ان پر ایک عرض کی طرح صادق آئے گا تشکیک کے ساتھ۔'' (یہاں صرف ترجمہ نقل کیا گیا ہے۔ یہ حکماء کا مشہور مذہب ہے۔ غالباً وجود مطلق سے یہاں مراد ''ہونا'' ہے' صوفیاء کا وجود مطلق مراد نہیں ہے۔ تو وجود مطلق ایک نوع کی طرح نہیں ہے کہ وہ وجود واجب جو عین ذات ہے اور وجود موجودات پر صادق آئے بلکہ وہ عرض' جو خارج از ماہیت ہوتی ہے' کی طرح لاحق ہوگا وجود واجب اور موجودات ممکنات کو تشکیک کے ساتھ۔ یعنی برابر درجے پر نہیں ہوگا تو واجب اور ممکن کو ایک سطح پر موجود نہیں کہا جا سکتا۔) اس کے بعد مُلّا میبذی بعض محقق حکماء کا مسلک ایک عبارت میں نقل کرتے ہیں (مکمل عبارت حضرت تھانوی نے یہاں نقل نہیں کی۔ اس عبارت میں وہی مسلک بیان کیا گیا ہے جو پہلے بعض حکماء یہ کہتے ہیں کہ عنوان سے بیان کیا جا چکا ہے۔ اور اوپر جو پوری عبارت نقل کی ہے اس میں حکماء کا مشہور مذہب بیان کیا گیا ہے جس کا اس رسالہ میں دی گئی مثال اور اس کے ذریعے سے مختلف مواقف کی توضیح و تفہیم سے تعلق نہیں ہے)۔

یہ دو مذاہب علماء اور حکماءِ اسلام کے تھے۔ اب جہاں تک بات ہے اہلِ کشف کی تو وہ اپنے کشف اور ذوق کی بنیاد پر ممکنات سے وجود کی مکمل طور پر نفی کرتے ہیں (یعنی ممکنات کو حقیقتاً وجود حاصل ہی نہیں ہے)۔ کشف کے دعویٰ کو پرکھنے کا ذریعہ چونکہ ہمارے پاس نہیں ہے اس لیے صرف ان کے قول ہی کی تصدیق کی جاتی ہے۔ باقی اپنے ذوق کو انہوں نے اس طرح بیان کیا ہے کہ تمام خیرات اور کمالات کی اصل و بنیاد وجود ہے اور تمام شرور و نقائص عدم سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب تمام خیرات و کمالات اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہیں تو ان کی اصل و بنیاد یعنی وجود بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی صفت ہوگا۔ ممکنات کے لیے وجود کو ثابت کرنا ایک درجے میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شراکت کو ظاہر کرتا ہے۔ اگرچہ علماء کا جواب بالکل واضح ہے کہ جب وجود اور اس کے تابع خیرات و کمالات اللہ تعالیٰ کے لیے اس کی اپنی ذات کے اقتضاء سے اور درجہ کمال پر ثابت ہیں اور ممکنات کے لیے یہ ان کی ذات کا اقتضاء نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کیے گئے ہیں اور درجہ نقص پر ثابت ہیں تو اس سے شراکت تو ثابت نہیں ہوتی' مگر صوفیاء اپنے اس دعویٰ میں ذوق کی بات کرتے ہیں اس لیے اس معاملہ میں ان سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ذوق کسی قطعی عقلی یا نقلی دلیل کے خلاف بھی نہیں ہے' اس لیے ان کے لیے اس کے قائل ہونے کی گنجائش ہے۔ (اگر کسی دلیل قطعی کی مخالفت ہوتی تو پھر صوفیاء اہلِ کشف کا ردّ کرنا ممکن ہوتا کہ ایک معروضی بنیاد ہوتی جبکہ ایسا نہیں ہے تو معاملہ درجہ امکان میں ہے۔ جب درجہ امکان میں ہے تو قائل ہونے کی گنجائش ہے۔ حضرت تھانویؒ نے گنجائش کا لفظ ہی استعمال کیا ہے۔ یہاں سے ہمیں حضرت کی کمال احتیاط کا اندازہ ہوتا ہے کہ علماء ظاہر اور صوفیاء ہر دو طبقوں پر حرف

نہ آئے۔) دلیل عقلی کے خلاف نہ ہونا تو ظاہر ہے۔ چنانچہ بعض حکماء خود ممکنات سے اتصاف بالوجود کی نفی کرتے ہیں' جیسا کہ میں نے فاضل میبذی کی عبارت پہلے نقل کی ہے۔(اس عبارت سے اتصاف بالوجود کی نفی اس حیثیت سے ہوتی ہے کہ وجود اس کا ذاتی نہیں ہوتا' باقی ممکنات حقیقتاً موجود ہوتے ہیں۔ یہیں سے صوفیاء اور حکماء کا فرق واضح ہوتا ہے کہ صوفیاء کے ہاں ممکنات حقیقتاً موجود ہی نہیں ہیں۔ واللہ اعلم!) اگرچہ ان کے دلائل کے بعض مقدمات میں کلام ہوسکتا ہے مگر اس مسئلہ کا خلافِ عقل نہ ہونا تو ثابت ہو جاتا ہے۔ خلافِ نقل نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ نقل ایسی باریک باتوں اور تفصیلات کو بیان نہیں کرتی' وہ موجود ہونے کے ساتھ جو احکامات متعلق ہیں ان کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ احکامات وجود کے ساتھ حقیقی اتصاف میں بھی ثابت ہوتے ہیں اور مجازی میں بھی۔ اس سے تو کسی کو انکار نہیں۔ اس لیے یہ مسئلہ خلافِ نقل بھی ثابت نہ ہوا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک وجود صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہے۔ ممکنات کو اگرچہ وہ موجود کہتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وجود ان کی صفت ہے بلکہ ان کی مراد یہ ہے کہ ممکنات کو وجود سے ایک نسبت اور تعلق حاصل ہے۔ اس کی حقیقت تو معلوم نہیں مگر بعض جہات اور احکام معلوم ہوئے ہیں جن کو مختلف طریقے پر بیان کر دیا گیا ہے' جیسا کہ آگے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے بیان میں واضح ہو جائے گا۔ محض حقیقت معلوم نہ ہونے سے جو اشکالات و اعتراضات پیش کیے جاسکتے ہیں تو اس سے تو متکلمین بھی محفوظ نہیں۔ جیسے مسئلہ ایجاد بالاختیار (اللہ تعالیٰ کا اپنی قدرت و ارادے سے مخلوقات کو پیدا کرنا) پر فلاسفہ نے متکلمین پر سخت اشکالات و اعتراضات کیے ہیں مگر ان کے کافی جوابات متکلمین نے دیے ہیں تو ان اعتراضات سے ان کو کوئی نقصان نہیں ہوا (فلاسفہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو موجب بالذات یا علت تامہ کہتے ہیں کہ اس سے موجودات اور معلولات کا صدور ایجاد و اختیار سے نہیں ہوتا بلکہ اس کی ذات کا اقتضاء ہوتا ہے۔ یعنی یہ ممکن نہ تھا کہ مخلوقات وجود میں نہ آتیں۔ متکلمین اہلِ سُنّت کے نزدیک اللہ تعالیٰ پر کچھ بھی واجب نہیں ہے)۔ اسی طرح صوفیاء نے بھی اعتراضات کے جوابات دیے ہیں جن میں سے کچھ کا ذکر آگے آئے گا۔ یہ صوفیاء کا مکمل مسلک ہے جس پر تمام صوفیاء متفق ہیں اور وجود کے تعدد کے انکار پر کچھ حکماء بھی صوفیاء کے ساتھ متفق ہیں۔ صوفیاء کے آگے اس مسئلے پر دو مذاہب ہیں۔ ایک مذہب شیخِ اکبر ابن عربیؒ کا ہے اور دوسرا مذہب حضرت مجدد الف ثانیؒ کا۔ (جاری ہے)

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ہمارے عقائد پر جدید تعلیم کے اثرات

پروفیسر ڈاکٹر رشید ارشد

اس موضوع کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا حصہ ’’ہمارا تعارف کیا ہے اور ہمارا تصوّرِ علم کیا ہے؟‘‘ دوسرا حصہ ’’جدید تصورِ علم اور ہمارے عقائد پر اس کے اثرات۔‘‘

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہمارا بنیادی تعارف ’’عبداللہ‘‘ کا ہے کہ ہم اللہ کے بندے ہیں۔ یہی ہمارا جوہر اور ہماری اصل ہے۔ ایک عرصے سے ہمارے ہاں فیشن سا بن گیا ہے اور یہ بات بہت زیادہ کہی جاتی ہے کہ ہمارا اوّلین تعارف انسان ہونا ہے جبکہ مسلمان‘ عیسائی‘ ہندو‘ سکھ اور پارسی ہونا بعد کا ایک تعین ہے۔ اس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ انسانیت کو ہم اپنے ’’جوہر‘‘ کے طور پر دیکھتے ہیں‘ حالانکہ یہ بات درست نہیں ہے۔ ہمارا جوہر حقیقت میں انسان ہونا نہیں بلکہ ’’عبد‘‘ یعنی بندہ ہونا ہے۔ فلسفے اور منطق میں وجود کے متعلق دو اصطلاحات ’’واجب الوجود‘‘ اور ’’ممکن الوجود‘‘ استعمال ہوتی ہیں۔ واجب الوجود کا ہونا لازمی ہے اور نہ ہونا ناممکن ہے۔ یہ وہ وجود ہے جو اپنی بنیاد پر خود سے قائم ہے۔ فلسفے میں اس کو necessary being کہا جاتا ہے۔ ایک ہے ممکن الوجود جس کو contingent being کہا جاتا ہے۔ یہ وہ ہوتا ہے کہ جس کے ہاں عدم اور وجود برابر ہو‘ یعنی جو ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا۔ جو نہیں تھا‘ پھر ہوا‘ پھر نہیں ہوگا‘ یہ ممکن الوجود ہے۔ لہٰذا جس طرح اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہے اور مخلوق ممکن الوجود ہے‘ اسی طرح اللہ اور ماسوا اللہ میں ایک ہی نسبت ہے کہ وہ خالق ہے اور باقی سب مخلوق ہیں۔ یہی نسبت یہاں اس طرح سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ معبود ہے‘ باقی سب عبد ہیں۔

ہمیں زندگی کے ہر معاملے میں اس بات کو دیکھنا ہے کہ اس وجود یعنی ہستی کے تصوّر کا میری بندگی کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ اگر میں بنیادی طور پر ایک مذہبی وجود ہوں تو اب مجھے ہر چیز کو اسی نظر سے دیکھنا ہے۔ مجھے یہ دیکھنا ہے کہ جو کچھ میں اختیار کر رہا ہوں‘ چاہے وہ کوئی چیز ہو یا کوئی تصوّر‘ یہ میرے مذہبی وجود کو یا میری بندگی کے وجود کو کہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچا رہا‘ اس کو متاثر تو نہیں کر رہا۔ یہ گویا میرا سب سے بڑا مسئلہ ہونا چاہیے۔ اصولِ فقہ میں مقاصدِ شریعت بیان کیے جاتے ہیں تو اس میں بتایا جاتا ہے کہ سب سے پہلے حفظِ دین یا حفظِ ایمان ہے‘ پھر حفظِ نفس یا حفظِ جان‘ اس کے بعد حفظِ نسل‘ حفظِ مال اور حفظِ آبرو ہیں۔ یہ درجہ بندی اس اعتبار سے ہے کہ شریعت کے سارے احکام ان پانچ میں سے کسی نہ کسی درجے کے تحت آئیں گے۔ لہٰذا یہاں یہ دیکھنا اہم ہے کہ سب سے بڑا فرض ایمان بچانا ہے۔ یہاں تک تو ہمارا تعارف تھا کہ ہم ’’اللہ کے بندے‘‘ ہیں۔ اب ہم تصوّرِ علم کی طرف آتے ہیں۔ تعلیم کے اندر غیر معمولی تاثیر ہوتی ہے‘ یعنی اس کا پورا عمل انسان کی تشکیل کرتا ہے۔ انسان کا ظاہری

وجود اس کے ماں باپ کا پروردہ ہوتا ہے‘ اور باطنی وجود کی پرورش معلم کرتا ہے۔ بقول علامہ اقبال:

شیخِ مکتب ہے اک عمارت گر
جس کی صنعت ہے روحِ انسانی

اور تعلیم کی تاثیر پر علامہ اقبال کا شعر دیکھیے:

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے‘ اسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

یہاں علامہ اقبال جس تعلیم پر گفتگو کر رہے ہیں اس کی تاثیر منفی ہے‘ یعنی یہ تعلیم سونے کے پہاڑ کو مٹی بنا دیتی ہے‘ اور اس کا برعکس بھی ٹھیک ہے کہ مٹی کا ایک ڈھیر ہو اس کو تعلیم دے دیں‘ شعور دے دیں تو وہ سونے کا ہمالہ بن سکتا ہے۔ ایک اور جگہ وہ فرماتے ہیں:

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروّت کے خلاف

یہاں کلیسا سے مراد چرچ نہیں بلکہ جدید مغرب ہے۔

شعور اور وجود کی ایک پرانی تقسیم ہے‘ یعنی انسان کی شخصیت میں ایک وجود ہے اور ایک شعور ہے‘ ایک علم ہے اور ایک اخلاق ہے۔ یہ تقسیم دنیا کی ہر روایت میں ملے گی۔ قرآنِ مجید میں جگہ جگہ ایمان اور عملِ صالح کا ایک جوڑا نظر آتا ہے۔ ایمان کا تعلق فکر‘ شعور اور تصور سے ہے جبکہ عمل صالح کا تعلق وجود‘ اخلاق اور عمل سے ہے۔ علامہ اقبال کے خطبات The Reconstruction of Religious Thought in Islam کے ابتدائیہ کا پہلا جملہ ہی یہی ہے کہ:

The Islam is a religion which emphasizes 'deed' rather than 'idea.'

اسلام کا تصوّرِ علم

اسلام میں علم سے مراد ہے کہ انسان یہ جان لے کہ وہ مخلوق ہے‘ وہ فانی ہے‘ اور یہ بھی جان لے کہ کائنات مخلوق ہے اور فانی ہے۔ مرنے کے بعد ایک عالم برپا ہوگا اور وہاں پر ایمان اور عملِ صالح کی بنیاد پر احتساب ہوگا۔ پھر یا تو ابدی راحتیں ہیں یا ابدی سزا ہے۔ قرآن مجید جس کو ’’العلم‘‘ کہتا ہے اس سے مراد یہ علم ہے۔ وہ صرف نحو‘ منطق اور فقہ کا علم بھی نہیں ہے‘ اور نہ ہی وہ قرآن اور حدیث کا ٹیکنیکل معنوں میں یعنی تفسیر اور علمِ حدیث کا علم ہے۔ امام بخاریؒ نے ’’الجامع الصحیح‘‘ میں ایک ترجمۃ الباب قائم کیا ہے: العِلمُ قَبْلَ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ‘ کہ کچھ کہنے اور کرنے سے پہلے ایک علم ہے۔ اس کے شروع میں وہ سورۂ محمد کی آیت لے کر آئے ہیں: ﴿فَاعْلَمْ

اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ﴾ (آیت ۱۹) ’’جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے‘‘۔ اسی طرح ہمارا تصورِ علم تو یہ ہے: ﴿قُلۡ هَلۡ یَسۡتَوِی الَّذِیۡنَ یَعۡلَمُوۡنَ وَ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ؕ﴾ (الزمر:۹) ’’کہو کہ: کیا وہ جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے سب برابر ہیں؟‘‘ یہاں جاننے والے اور نہ جاننے والے سے مراد فزکس‘ کیمسٹری‘ بیالوجی‘ جیالوجی اور اسٹرانومی جاننے والے یا نہ جاننے والے نہیں ہیں۔ یہاں مبحث وہی ہے جو قرآنِ مجید دوسری جگہ کہتا ہے: ﴿وَ لٰکِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ لَا یَفۡقَهُوۡنَ ۝۷﴾ ’’لیکن یہ منافق لوگ نہیں سمجھتے‘‘ اور ﴿وَ لٰکِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ۝۸﴾ (المنافقون) ’’لیکن یہ منافق لوگ نہیں جانتے۔‘‘ تو وہ کون سا تفقہ ہے جس کی بات قرآن کر رہا ہے؟ دُنیاوی معاملات میں تو وہ لوگ بہت سمجھ دار تھے‘ چال بازیاں آتی تھیں‘ لہٰذا کیا چیز ان کے پلّے نہیں پڑ رہی: ﴿یُخٰدِعُوۡنَ اللّٰهَ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ۚ وَ مَا یَخۡدَعُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَهُمۡ وَ مَا یَشۡعُرُوۡنَ ۝۱۲﴾ (البقرۃ) ’’وہ اللہ کو اور ان لوگوں کو جو (واقعی) ایمان لا چکے ہیں دھوکا دیتے ہیں اور (حقیقت تو یہ ہے کہ) وہ اپنے سوا کسی اور کو دھوکا نہیں دے رہے لیکن انہیں اس بات کا احساس نہیں ہے۔‘‘ ہمارا اصل تصورِ علم یہ ہے۔

بطورِ مثال ایک واقعہ ملاحظہ ہو۔ کسی نے امام حسن بصریؒ سے کہا کہ آپ تو یہ کہتے ہیں اور فلاں فقیہہ یہ کہہ رہے ہیں۔ انہوں نے فرمایا:

ثَكِلَتْكَ أُمُّكَ، وَهَلْ رَأَيْتَ فَقِيهًا بِعَيْنِكَ؟ إِنَّمَا الْفَقِيهُ الزَّاهِدُ فِي الدُّنْيَا الرَّاغِبُ فِي الْآخِرَةِ، الْبَصِيرُ بِدِينِهِ الْمُدَاوِمُ عَلَى عِبَادَةِ رَبِّهِ، الْوَرِعُ الْكَافُّ عَنْ أَعْرَاضِ الْمُسْلِمِينَ، الْعَفِيفُ عَنْ أَمْوَالِهِمْ النَّاصِحُ لِجَمَاعَتِهِمْ.(رد المحتار علی الدر المختار،ج:۱، ص:۳۷)

’’تمہاری ماں تمہیں روئے‘ تم نے کبھی زندگی میں فقیہہ دیکھا بھی ہے یا بس صرف فقاہت کا نام ہی سن لیا ہے؟ فقیہ تو وہ ہے جو دنیا میں زہد اختیار کرتا ہے‘ آخرت کی طرف رغبت کرتا ہے‘ اپنے دین کی بصیرت رکھتا ہے‘ اپنے رب کی بندگی پر مداومت کرتا ہے‘ صاحبِ ورع ہے یعنی شبہات سے بچتا ہے‘ مسلمانوں کی عزتوں کو بے آبرو کرنے سے اپنے آپ کو روکتا ہے‘ ان کے اموال کے بارے میں عفت مآب ہے اور ان کی جماعت کے ساتھ خیر خواہی کرنے والا ہے۔‘‘

ماقبل کی گفتگو میں ’’العلم‘‘ کی تعریف سامنے آئی‘ لیکن اس کے علاوہ اور بھی علوم ہیں۔ اگر آپ اس کی درجہ بندی اور مراتب سمجھنا چاہیں تو امام غزالی کی کتاب ’’اِحیاءعلوم الدین‘‘ کے پہلے باب ’’کتاب العلم‘‘ کو تفصیل سے پڑھ لیں۔ اگر اختصار مطلوب ہو تو امام غزالی کی علمی سوانح ’’المنقذ من الضلال‘‘ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جو انگریزی میں Deliverance from Error کے نام سے چھپا ہے۔ اردو میں بھی اس کے کئی تراجم موجود ہیں۔ اس میں امام غزالی نے علوم کی اقسام بتائی ہیں‘ اس کا مطالعہ کریں۔ انہوں نے اس میں فلسفے اور اس کی اقسام مثلاً‘ الدھریون‘ طبیعیون‘ الٰھیون وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی صاحب بڑے فاضل آدمی تھے۔ انہوں نے ایک اصطلاح متعارف کروائی ’’علم بالوحی‘‘۔ یہ متن یعنی قرآن وسُنّت کا علم ہے۔ ایک علم ہے ’انسانی استعداد کا زائیدہ علم‘‘ یعنی وہ علم جو انسانی استعداد سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک Revealed

Revealed کے مقابلے میں تسلیم سے Knowledge ہے اور ایک Acquired Knowledge ہے۔ بات شروع ہوگی۔ تسلیم، تفہیم، تعمیل اور ایک اور لفظ ہمارے استاذ کہتے تھے تحویل' کہ سب سے پہلے آپ مان لیں' پھر سمجھیں' پھر اس پر عمل کریں اور پھر تحویل کو وہ حال کے معنیٰ میں بیان کرتے ہیں' حالانکہ یہ معروف استعمال نہیں ہے۔ تحویل کا مطلب تو مڑنے کا ہوتا ہے' جیسے تحویلِ قبلہ وغیرہ۔ چنانچہ تحویل اس معنوں میں کہ جیسے اس کو اپنا حال بنالیں۔

اگر آپ نے دیکھنا ہو کہ ہمارے علوم کی نوعیت کیا ہے تو ایمان یعنی ہمیں کچھ ماننا ہے' اسلام کا مطلب ہمیں کچھ کرنا ہے اور احسان کے معنی ہیں کہ ہمیں کچھ بننا ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ: إِنَّ الصِّدْقَ يُنْجِي وَالْكَذِبَ يُهْلِكُ ''سچائی نجات دیتی ہے اور جھوٹ ہلاکت میں ڈالتا ہے۔'' یہ گویا ایمان کی سطح پر ہے۔ پھر آپ کو سچ بولنا ہے اور جھوٹ سے بچنا ہے۔ یہ ایک عمل ہے۔ پھر آپ کو سچا بننا ہے۔ سچ بولنا اور سچا بننا ایک نہیں ہے' یہ وہی وصف ہے کہ جس کے بارے میں ترمذی شریف میں اللہ کے نبی ﷺ کے الفاظ نقل ہوئے ہیں کہ ایک انسان سچ بولتا ہے اور بولتا رہتا ہے' سچ کا اہتمام کرتا ہے یہاں تک کہ: ((يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ صِدِّيقًا)) ''اللہ کے ہاں سچا لکھ لیا جاتا ہے۔'' یہ جو بننے کا عمل ہے' ہونے کا عمل ہے' یہ ہمارے ہاں علم کا آخری درجہ ہے کہ وہ علم ہم نے قبول کیا' اس کے بعد اس پر عمل کیا اور پھر اس کو اپنا حال بنایا۔ لہٰذا یہ ہمارے ہاں علم کا تصوّر ہے۔ جو دوسرے علوم ہیں ہم ان کو بھی ٹھیک کہتے ہیں کہ انہیں بھی حاصل کرنا چاہیے' لیکن جب ہم ''العلم'' بولتے ہیں یا ہماری روایات میں آتا ہے اس سے قال اللہ اور قال الرسول مراد ہوتا ہے۔ اب اس کے بعد آپ دنیا کے باقی علوم حاصل کریں۔

مثال کے طور پر ارسطو کو اگر آپ پڑھیں تو وہ سب سے پہلے علم کے مقاصد پر بات کرتا ہے کہ مقاصدِ علم کیا ہیں۔ ارسطو نے سب سے بنیادی مقصد ''سعادت'' قرار دیا ہے۔ عام طور پر اس کا ترجمہ happiness کیا جاتا ہے' جو درست نہیں ہے۔ اصل میں سعادت Contemplation of the reality سے حاصل ہوتی ہے' جس کا مطلب ہے حقیقتِ کبریٰ پر غور کرنا۔ یہ سب سے اونچا درجہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ To live a moral and ethical life۔ وہاں سے جو معرفت حاصل ہوئی اس کے مطابق ایک اخلاقی زندگی بسر کریں۔ ارسطو نے ''ٹیکنے'' کو تیسرا درجہ قرار دیا ہے جس کو ہمارے ہاں ٹیکنالوجی کہا جاتا ہے' یعنی طاقت۔ اس دنیا میں آپ رہ رہے ہیں تو جو ضرورتیں آپ سے وابستہ ہیں آپ ان سے اس دنیا کو تلاش کریں گے۔ آگ کی ضرورت پڑ گئی تو آپ نے دو پتھر رگڑے اور اس سے آگ نکل آئی۔ اسی طرح اپنی ضرورت کے لیے آپ نے پہیہ ایجاد کرلیا۔ یہ سارے معاملات آپ اپنی دنیاوی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے' اپنے نفس کی بقا کے لیے کرتے ہیں۔

اس وقت مغرب کا جو تصوّرِ علم ہے اس میں پہلی دو چیزوں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس وقت علم کا مقصود طاقت ہے' یعنی پیش گوئی کے ذریعے کنٹرول۔ یہ سائنس ہے۔ اسی وجہ سے وہ کہتے ہیں کہ فزکس اور کیمسٹری کے علم میں

طے شدہ نتائج ہیں‘ بنے بنائے سانچے ہیں۔ آپ پیش گوئی کر سکتے ہیں تو اختیار بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ آج جو مولوی لوگ ہیں ان کے پاس کون سا علم ہے؟ یہ ہمیں کیا بتا سکتے ہیں؟ کیا یہ بتا سکتے ہیں کہ یہ یہ کرلو گے تو ایسا ہوجائے گا؟ ہمارے ہاں یہ بھی ایک تصور ہے کہ یہ بھی عروج وزوال کا ایک الٰہی قانون ہوتا ہے کہ یہ چار مراحل طے کرلیں گے تو ایسا ہوجائے گا۔ میں اس کو مغالطہ سمجھتا ہوں۔ عروج وزوال کے متعلق ہمارے ہاں بہت خلطِ مبحث پیدا ہوا ہے۔ دنیا میں قوموں اور قیادتوں کا بھی ایک قانونِ فطرت ہے اور وہ کوئی بھی قوم اختیار کرلے گی تو وہ عروج پر آجائے گی۔ میں اس بات کو بہت بڑا مغالطہ سمجھتا ہوں۔ جب سے ہم استعمار کا نشانہ بنے یہ بیانیہ شروع ہوا۔

مغرب کا تصوّرِ علم

یہ جو روشن خیالی ہے‘ اس کے حوالے سے ایک انسائیکلو پیڈیا چھپا تھا جو فرانسیسی فلاسفہ نے تیار کیا تھا‘ انقلابِ فرانس میں بھی ان کا ہاتھ ہے۔ ان فلاسفہ میں والٹیئر بھی شامل ہے۔ اس انسائیکلو پیڈیا کا چیف ایڈیٹر Denis Diderot تھا جو ایک بڑا نام ہے۔ میں اس کا ایک اقتباس یہاں نقل کرتا ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ اٹھارہویں صدی کے اختتام میں مغرب میں تصورِ علم کیا تھا۔ ۱۵۰۰ء تک جو مسلمانوں کا تصوّرِ علم میں نے ذکر کیا ہے پوری دنیا کا تصوّرِ علم تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ وہی تھا۔ عیسائیوں اور ہندوؤں کا بھی وہی تھا جو مسلمانوں کا تھا۔ اس کے جوہر میں کوئی فرق نہیں تھا۔ Denis Diderot نے اب آ کر کہا ہے:

> *"There are three principal means of acquiring knowledge ... observation of nature, reflection, and experimentation. Observation collects facts; reflection combines them; experimentation verifies the result of that combination."*
>
> *(Diderot, 1784)*

> ’’علم حاصل کرنے کے تین بنیادی ذرائع ہیں: فطرت کا مشاہدہ‘ عکاسی‘ اور تجربہ۔ مشاہدہ حقائق کو جمع کرتا ہے‘ عکاسی انہیں یکجا کرنے کا کردار ادا کرتی ہے‘ جبکہ تجربہ یکجا ہونے کے بعد اس کے نتیجے کی تصدیق کرتا ہے۔‘‘

سائنسی طریقۂ کار کو انہوں نے تین جملوں میں بالکل سادگی سے بیان کیا‘ جیسے دوسری تیسری کلاس کے بچے کو سمجھاتے ہیں۔ اگلا جملہ جان لاک کا ہے جو بڑے فلسفی ہیں‘ کہتے ہیں:

> *"No man's knowledge can go beyond his experience."*

> ’’کسی انسان کا علم اس کے تجربے سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔‘‘

یعنی جو حسیات اور جو تجربے ہیں کوئی آدمی اس سے ماوراء نہیں جا سکتا۔ علامہ اقبال نے اس تھیسز کو اپنے خطبات میں قبول کرلیا اور پھر بتایا کہ ٹھیک ہے ہم نے مان لیا کہ علم کا تجربی ہونا ضروری ہے۔ کانٹ نے اپنے تئیں جس طریقے سے آ کر خدا کے وجود کے دلائل کو اڑا کر رکھ دیا‘ علامہ اقبال نے اس کو own کیا کہ علم وجودی‘ Ontological Cosmological and Teleological دلائل نہیں چلیں گے۔ علامہ اقبال نے کہہ دیا کہ ٹھیک ہے علم

تجربے سے ہوگا، لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک تجربہ ہوتا ہے فزیکل سینس کے ذریعے اور ایک تجربہ ہوتا ہے روحانی یا مذہبی۔ یہاں سے ان کا تھیسز شروع ہوتا ہے۔ علامہ اقبال سمجھتے تھے کہ جب اخلاقیات (Ethos) وہی ہے تو مجھے بھی اسی پر کسی طریقے سے اپنی روایت کھڑی کرنی چاہیے تاکہ بچت ہو جائے ورنہ معاملہ ہاتھ سے نکل رہا ہے۔

جان لاک کے بعد کانٹ آتے ہیں:

"All our knowledge begins with the senses, proceeds then to the understanding, and ends with reason. There is nothing higher than reason."

’’ہمارا تمام علم حواس سے شروع ہوتا ہے، پھر ادراک کی طرف بڑھتا ہے، اور عقل پر ختم ہوتا ہے۔ لہٰذا عقل سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔‘‘

ان کے جدید تہذیب کے پیغمبر یہ باتیں کر رہے ہیں۔ یہ ہلکے لوگ نہیں ہیں۔ فلسفہ ڈیپارٹمنٹ میں یا پولیٹیکل سائنس میں جان لاک کا بہت بلند درجہ ہے۔ اسی طرح فلسفے میں کانٹ کا ایک اعلیٰ مقام ہے۔ تو کانٹ نے بڑی صفائی سے کہا کہ علم کا آغاز حواس سے ہوتا ہے اور اس کی انتہا اور تکمیل میرے ذہن میں ہوتی ہے۔ اس کے بہت عرصے بعد ایک فرانسیسی فلسفی لیوتار آیا، جس نے ۱۹۷۹ء میں ایک کتاب لکھی۔ لیوتار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اس کا early theorist ہے۔ اس کی کتاب ہے:

The Postmodern Condition: A Report on Knowledge

اگرچہ مابعد جدیدیت کی تعریف بہت مشکل ہے، یعنی وہ اپنی جوہر میں ایسا ہے کہ ڈیفائن نہیں ہونا چاہتا، مگر لیوتار نے اپنی اس کتاب میں عام طور پر مابعد جدیدیت کی جو تعریف جگہ جگہ کی ہے وہ بہت مشہور ہے۔ وہ تعریف یہ ہے کہ Incredulity Towards Metanarratives یعنی ہر طرح کے مہا اور کبیری بیانیوں سے بداعتمادی۔ اس کتاب میں انہوں نے چند باتیں کہیں۔ ایک اس نے کہا کہ اب علم میں سب سے اہم چیز performativity ہے۔ یعنی یہ جو تصور تھا کہ ایک Correspondence Theory of Truth ہوتی ہے اور ایک Coherence Theory ہوتی ہے، اب اس کی جگہ Pragmatic Theory یعنی بس واقعاتی علم ہوتا ہے۔ ایک Formativity Criteria ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اب Mercantilization of Knowledge ہوگا، یعنی علم کاروبار بن جائے گا۔ علم ایک قابل فروخت جنس بن جائے گا۔

پھر آگے کہتا ہے کہ کمپیوٹرائزیشن کا جو دور آرہا ہے، واضح رہے کہ یہ ستر کی دہائی میں اس وقت کہا گیا تھا جب سائبر دور کا آغاز ہو رہا تھا، کہ اس کے بعد اب علم میں Legitimation Crisis پیدا ہو جائے گا۔ پچاس سال میں اب وہ بات مکمل ہوگئی کہ آج آدمی کے بجائے روبوٹ یا مشین ہے۔ ہم نے وہ ساری صلاحیتیں ادھر منتقل کر دیں۔ اسی طرح اس نے کہا تھا کہ اب دنیا میں جو جنگیں ہوں گی وہ ڈیٹا پر ہوں گی۔ یہ بات ۱۹۷۰ء میں کہہ دی گئی تھی کہ اب سب سے بڑا ریسورس ڈیٹا ہوگا۔ آج پروفیسر Yuval Noah Harari ڈیٹا ازم کا لفظ

استعمال کرتا ہے کہ آنے والے مذہب کا نام ڈیٹا ازم ہے۔ چنانچہ اب اس علم کی یہ گت بن رہی ہے جو مغرب میں وجود میں آیا۔ اس علم میں سے انسان منہا ہو رہا ہے۔ Renaissance اور Enlightenment کا سارا آئیڈیا ہیومن ازم تھا اور وہ ہیومن ہی غائب ہو گیا۔ یعنی آپ نے معاذ اللہ‘ خدا سے غداری کی ہے تو پھر انسانیت نام کا جانور زیادہ دیر برقرار نہیں رہ سکتا۔ The Death of God Becomes the death of Man۔ ایک صدی لگی ہے جب اس نے Death of God کا اعلان کیا تھا‘ معاذ اللہ! اب انسان کا قصہ ختم ہو گیا۔ اب ہر سال یومِ فلسفہ منایا جاتا ہے‘ غالباً نومبر یا اکتوبر کی تیسری جمعرات کو۔ اس میں ایک تھیم دیتے ہیں۔ دو سال پہلے یہ تھیم تھی: ’’فورتھ کمنگ ہیومن‘‘ یعنی نیا آنے والا انسان۔ اب معلوم نہیں وہ کیا ہو گا۔ ان کے نزدیک آج کا جو انسان ہے یہ بچ نہیں سکتا۔ یہ sustainable نہیں ہے۔ اب یا ٹرانس ہیومنسٹ ہے یا اینٹی ہیومنسٹ ہے۔ یا تو کہتے ہیں کہ ماڈل یہ ہے کہ Cyborgs وغیرہ جیسے مشین بن جاؤ جبکہ ایک ماڈل یہ ہے کہ جانور بن جاؤ۔ یعنی تم نے اپنے آپ کو اس کائنات کا جو دولہا بنا لیا تھا اس نے مسائل پیدا کیے۔ تم اپنے آپ کو مچھر‘ مکھی اور گھاس کے تنکے کے برابر لے آؤ تو اس سے تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ بہرحال ابھی تک میں نے یہ بتایا ہے کہ ان کا تصورِ علم کیا ہے اور ہمارا کیا ہے۔

تعلیم کیا ہے؟

اب تعلیم کیا ہوتی ہے؟ تعلیم وہ عمل ہے کہ اپنے وِرثہ اور ترکہ کو‘ جو کچھ اپنے بڑوں سے ہمیں ملا ہے اسے اپنی اگلی نسلوں تک پہنچانا۔ اس عمل کو عام طور پہ تعلیم کہا جاتا ہے۔ یہ استناد کے ساتھ چلتا ہے۔ یعنی اپنے بڑوں سے سیکھا‘ پھر آگے سکھایا‘ پھر آگے سکھایا‘ اس میں کچھ اضافے بھی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں تعلیم کا تصور یہ ہے کہ یہ ایک اخلاقی اور بہت بڑا عمل ہے۔ انسان کی تشکیل میں اس کا ایک بہت بڑا کردار ہے۔ جیسے حسن بصریؒ نے کہا کہ: لَوْلَا الْعُلَمَاءُ لَصَارَ النَّاسُ مِثْلَ الْبَهَائِمِ ’’اگر علماء نہ ہوتے تو لوگ چوپایوں کی طرح ہوتے‘‘۔ وہی کہتے ہیں: الدُّنْیَا كُلُّهَا ظُلْمَاً إِلَّا مَجَالِسَ الْعُلَمَاء ’’دنیا تو ساری کی ساری اندھیر ہے سوائے علماء کی مجالس کے‘‘۔ وہاں علم ہے‘ جبکہ اقبال نے کہا تھا: ؎

گمان آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی
(طلوعِ اسلام)

یہ قندیل علماء نے ہی تو جلائی ہوئی ہے۔ علماء کون ہیں؟ ’’اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ‘‘ جو پیغمبر کے وارث ہیں‘ جو علم کے وارث ہیں۔ علم کا جو ترکہ ان کے پاس ہے وہ آگے لے کر چل رہے ہیں۔

ہمارے ہاں تعلیم ایک اخلاقی عمل ہے کیونکہ ہمارے ہاں ہر عمل ایک اخلاقی عمل ہوتا ہے۔ یہ صرف ہمارے ہاں نہیں بلکہ پندرہویں‘ سولہویں صدی عیسوی تک پوری دنیا کا ethos یہی تھا کہ ہر چیز اخلاقی ہے۔ افلاطون

(Plato) کی ''ریپبلک'' ان کتابوں میں سے ہے جو طبع زاد ہے' جس میں اس نے بتایا ہے کہ ایک ریپبلک کیسی ہونی چاہیے۔ اس کتاب کا اسّی فیصد حصہ اخلاق پر مبنی ہے اور باقی تھوڑا سا حصہ سیاسیات پر مبنی ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ ہر کام اخلاقی ہوتا ہے۔ پہلے یہ تھا کہ:

Everything is moral, and education is basically a moral, ethical activity

اب ماڈرن تصور یہ ہے کہ: Everything is political۔ پولیٹیکل جدید معنی میں۔ پہلے تو سیاست اخلاق کا ایک جزو تھا۔ اگر تہذیب الاخلاق پر ابنِ حزم کی کتاب پڑھیں' ابن مسکویہ کی کتاب پڑھیں یہاں تک کہ شاہ ولی اللہ تک سب سے پہلے نفس' پھر تدبیرِ منزل' پھر سماج اور اس کے بعد سیاستِ مدن۔ یعنی تہذیب الاخلاق کا ایک ہی محل ہے جس سے ہوتے ہوتے آپ ادھر تک پہنچ گئے۔

ہر چیز پہلے اخلاقی تھی' اب سیاسی ہے اور سیاسی بھی جدید معنوں میں۔ سقراط' سینٹ آگسٹائن' امام الغزالی کے معنوں میں سیاسی نہیں بلکہ مکیاویلی کے معنوں میں۔ مکیاویلی نے کہا کہ The politics is basically amoral مطلب یہ ہوا کہ اس پر اخلاقیات کی کیٹگری عائد نہیں ہوتی۔ لیڈرز کہتے ہیں کہ یہ کرنا ہے' یہ کرنا ہے' یہ کرنا ہے۔ ان سے پوچھیں کہ آپ نے کیوں نہیں کیا' آپ نے جھوٹ بولا تھا تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں نہیں' بھئی اس چیز پر جھوٹ سچ کا اطلاق نہیں ہوتا' وہ ایک سیاسی بیان تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ amoral ہے یعنی وہاں پر اخلاقیات کا اطلاق نہیں ہوتا۔

روایتی تعلیم ایک اخلاقی عمل تھا' جدید تعلیم ایک سیاسی فیصلہ ہے۔ اگر ایک بائنری بنائے تو روایتی تعلیم اور علم اقداری تھا جبکہ جدید علم و تعلیم اقتداری ہے۔ یعنی وہاں اخلاقی تھا اور اب طاقت کی بنیاد پر ہے۔ ہمارے علم اور تعلیم کا مقصود بندگی تھا' بندگی کے لیے آسانی فراہم (fecilitate) کرنا تھا۔ اگر کسی کو جوتا گانٹھنے یا کپڑے بُننے کا علم سکھایا جا رہا ہے تو وہ بھی بندگی کے پیراڈائم میں ہے۔ ہم صرف قرآن و حدیث کی بات نہیں کر رہے بلکہ ہر چیز۔ ہمارے استاذ ایک جملہ کہا کرتے ہیں' شاعر جسے ابنِ عربی کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ ''ہمارے علوم متعدد ہیں اور ہمارا معلوم واحد ہے۔'' یعنی ہم تفسیر پڑھیں' حدیث پڑھیں' فقہ پڑھیں اور چارپائی بُننے کا علم سیکھیں تو اس میں بھی ہمارا مقصود اللہ ہے۔ بندہ بننا ہے۔ یہ علم ہے' جبکہ بندگی کا علم سیکھنا تعلیم ہے' چاہے وہ معاش کے لیے ہو یا کسی اور چیز کے لیے۔

اب یہ ہے کہ آپ کو معاذ اللہ' خدا سے آزادی حاصل کرنی ہے۔ جدید علم خدا سے آزاد کرنے کا ایک انسٹرومنٹ جبکہ جدید تعلیم خدا سے باغی کرنے کا ایک میکنزم ہے۔ اکبر نے کہا تھا:؎

اِک علم تو ہے بُت بننے کا' اِک علم ہے حق پر مرنے کا
اُس علم کی سب دیتے ہیں سند' اِس علم میں ماہر کون کرے!

جدید تعلیم بُت بنانے کا عمل ہے۔ یہ اپنی ساخت میں ایسی ہی ہے۔ اب اس میں علوم دینیات وغیرہ داخل

کر دیں تو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا کیونکہ وہ اپنے جوہر میں یہی ہے۔ پچھلے آٹھ دس سال میں کھمبیوں کی طرح موٹیویشنل سپیکر اٹھے اور جگہ جگہ انہوں نے نوٹنکی لگائی تو اس میں یہی چورن بیچا کہ جناب تم سب کچھ کر سکتے ہو' تم یہ ہو تم وہ ہو اور تمہارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ خاص طور پر پوپ سائیکالوجی بالکل غیر شرعی ہے' یعنی وہ بُت بنانا چاہتے ہیں' وہ خدا سے آزاد کرنا چاہتے ہیں۔ میں بار بار انگریز لوگوں کے ریفرنس دیتا ہوں تاکہ لوگ یہ نہ کہیں کہ جیسے ان پہ ایسے ہی تھوپ رہے ہیں۔ ہر دور میں ایک ایسا آدمی ہوتا ہے جو فیشن میں ہوتا ہے اور ہمارے ہاں جو لوگ دین سے بھاگنا چاہتے ہیں وہ اس کی کتابیں لے کر رہتے ہیں۔ ایک زمانے میں وہ کارل مارکس تھا' پھر برٹرینڈ رسل تھا۔ اس کے بعد اکیسویں صدی کے شروع میں نیو ایتھیزم میں Richard Dawkins تھا اور پچھلے چھ سال میں وہ ہراری (Yuval Noah Harari) ہے۔ اب اس نے پوری انسانیت کی تاریخ لکھ دی ہے Sapiens: A Brief History of Humankind اس نے بتایا ہے کہ مستقبل کا انسان کون ہوگا۔ اس نے بتایا انسان خدا بننے جا رہا ہے۔ یعنی وہ جو تصوّر دیا گیا تھا کہ ہم نے خدا کو معاذ اللہ' ذبح کر دیا ہے' اب ہم سب کو چھوٹا موٹا خدا بننا ہے۔ سارے تو بنیں گے نہیں' یہ ماسٹر کلاس بنے گی۔ میں آپ کو نام لے کر بتا سکتا ہوں' پانچ چھ لوگ ہیں Adam Smith نے اپنی کتاب میں ایک ٹرم Masters of Mankind استعمال کی تھی۔ یہ کون لوگ ہیں؟ وہ جو کہتے ہیں سب کچھ ہمارا ہو' ہمارے علاوہ کسی کا کچھ نہ ہو۔ وہ Elon Reeve Musk ہے' وہ Mark Elliot Zuckerberg ہے' وہ George Soros ہے وغیرہ۔ یعنی جو ماسٹر کلاس ہے وہ چند لوگوں پر مبنی ہے۔ اب اس علم کی بنیاد پر یہ لوگ ایک ماسٹر ریس پیدا کر لیں گے۔ یعنی اس وقت کرائسز یہ ہے کہ جیسے جین ایڈیٹنگ ہو رہی ہے' ہم ڈیزائنر babies کی طرف جا رہے ہیں۔ یعنی آپ کو ایک مینیو دیا جائے گا کہ بچے کی کیا رنگت چاہیے' بال کیسے چاہئیں' آنکھیں کیسی چاہئیں۔ نقش کیسے ہوں' وہ آپ بتا دیں اور پیسے بھریں۔ آئی کیو کتنا چاہیے۔ آپ خود سوچیں کہ یہ جو ماسٹر کلاس بنے گی تو ہمارے جیسے لوگ ان سے کیسے مقابلہ کریں گے؟ یعنی اس وقت جہاں تک بات جا رہی ہے ہم تو اصل میں غور نہیں کرتے' اور اچھی بات ہے غور نہیں کرتے کیونکہ غور کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

اگلے تین چار سال میں اے آئی وغیرہ جہاں تک پہنچ جائے گی' اس کے بعد پتا نہیں ہمارا اور آپ کا کیا بنے گا۔ یعنی وہاں پہ ایک روبوٹ کھڑا ہوگا' نہ اس کو اونگھ آئے' نہ اس کو نیند آئے' یعنی اس کی خدائی صفات ہیں۔ نہ وہ بھولتا ہے ﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا﴾ نہ اس کو چھینک آئے' نہ اس کے سر میں درد' نہ وہ بیگم سے لڑ کر آیا' گھر میں مسائل ہی نہیں ہیں۔ وہ جو ایک وبا پھیلی ہوئی ہے کہ ہر لیکچر کے لیسن پلانز بنائیں' لرننگ آؤٹ کمز بنائیں۔ وہ انسان ہے کوئی روبوٹ تو نہیں ہے۔ البتہ روبوٹ کو لیسن پلانز بتائے جائیں گے۔ وہ یہی تو چاہ رہے ہیں کہ روبوٹ ہو۔ جب روبوٹ آجائے گا پھر ہم آپ پتا نہیں کیا کریں گے۔ یہ علم اب یہاں تک جا رہا ہے۔ اس میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ وہ جو نام نہاد ہیومنزم تھا اس کا جنازہ دو تین سو سال میں ہی نکل گیا ہے کہ انسان اب فارغ ہو گیا۔

مولانا روم نے کہا تھا کہ ''انسانم آرزوست!'' (مجھے انسان کی تلاش ہے۔) آج اس مصرعے کو پڑھیں تو کچھ عرصے بعد آپ کو لگے گا کہ انسان کدھر ہے' پتہ نہیں کیا کرتا ہے۔ اس کا معلوم نہیں کام کیا ہوگا۔ جب انڈسٹریل ریولیوشن آیا تھا تو وہاں پر بھی ایک بہت بڑا ہیومن ویسٹ پیدا ہوا تھا۔ اس کو dump کرنے کے لیے ان کے پاس کالونیز تھیں۔ یہ پورا ایک الگ موضوع ہے۔ اب کہاں dump کریں گے؟ جدیدیت ایجادِ وجود سے ایجادِ شعور کا سفر ہے۔ پہلے انہوں نے ہیومن باڈی کو مشین کے ذریعے replace کیا' اب وہ اپنے تئیں ہیومن consciousness کو replace کر رہے ہیں۔ اگرچہ ہراری کہتا ہے کہ یہ نہیں ہوسکتا۔ یہ اے آئی ہے' اے سی نہیں ہے یعنی وہ آرٹیفیشل consciousness نہیں ہے۔

یہ سب باتیں خوف ناک ہیں لیکن میں الحمدللہ ایک پورے اعتماد کی جگہ پہ کھڑا ہوا ہوں۔ کس بنیاد پہ کھڑا ہوا ہوں؟ میں اپنی وحی کی بنیاد پہ کھڑا ہوا ہوں کہ انسان کہیں نہیں جا رہا۔ انسانوں کی اکثریت بہ جائے گی لیکن انسان ان معنوں میں کہ وہ مسجودِ ملائک ہے' وہ زمین کا دولہا ہے' ختم نہیں ہوسکتا۔ یہ انسان اللہ کا بندہ بھی ہے۔ انہی انسانوں میں اللہ کے دین کے کسٹوڈین بھی ہیں۔ انہی انسانوں میں اللہ کی کتاب کے وارث بھی ہیں۔ یہ گویا جیسے ہمارے لیے ایک بڑی سہولت ہوگئی ہے کہ اگر ہم اپنے دین سے جڑے رہ جائیں گے تو پھر بچ جائیں گے۔ ہمارے ساتھ کچھ نہیں ہوسکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ ہم فنا ہوجائیں گے۔ ہمارے جسم ختم کردیے جائیں گے۔ اس سے کیا ہوتا ہے' مرتو ویسے بھی جانا ہے۔ یعنی اس وقت جو سب سے زیادہ مزے میں ہیں وہ تو غزہ کے لوگ ہیں۔ ہمیں لگتا ہے سب سے مشکل میں ہم ہیں۔ ان میں ایسے بھی ہو سکتے ہیں جنہوں نے شاید کبھی نماز بھی نہ پڑھی ہو لیکن ان کو کوئی میزائل لگ جائے تو وہ ان شاءاللہ جنت الفردوس میں چلے جائیں گے۔ ہمیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ ان کی لاٹری کیسے نکلی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ان کی مدد نہ کریں لیکن وہ تو بہت اچھے رہ گئے۔ مطلب مرنا تو ہے ہی' موت کا کیا مسئلہ ہے۔ اصل میں اس وقت ہمارا سب سے بڑا کرائسز یہی ہے کہ ''حُبُّ الدُّنْیَا وَکَرَاهِیَةُ الْمَوْتِ''یعنی دنیا کی محبت اور موت سے نفرت۔

جدید تعلیم کے مقاصد

جدید تعلیم ایک پیداواری عمل ہے۔ میں چند نکات آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ John Taylor Gatto کی بہت مشہور کتاب ہے Weapons of Mass Instruction۔ اس کے شروع میں وہ ایک دوسرے مفکّر Alexander Inglis کا ذکر کرتا ہے۔ اس نے ۱۹۱۸ء میں کتاب Principles of Secondary Education لکھی۔ الیگزینڈر انگلس کے نام پہ ہاورڈ میں ایک لیکچر سیریز بھی ہے' جیسے چومسکی کی کتاب پہ ہے' رسل کے نام پہ ہے۔ انہوں نے چھ نکات بتائے ہیں کہ ماڈرن ایجوکیشن کے مقاصد کیا ہیں۔

پہلا یہ ہے کہ Adjustive or adaptive function۔ تعلیم کا ایک مقصد یہ ہے کہ آپ کو خاص طرح کے لوگ پیدا کرنے ہیں جو اتھارٹی کے سامنے خاص طرح سے submissiveness اختیار کریں۔

۱۹۲۰ء میں شیخ الہند جب مالٹا سے آزاد ہوئے تھے‘اس کے بعد وہ علی گڑھ گئے اور وہاں جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھی گئی تھی۔اس موقع پر انہوں نے جو خطبہ دیا اس کا ایک جملہ میں پڑھنا چاہتا ہوں۔’’ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے داموں پر غلام پیدا کرتے رہیں۔‘‘ جدید تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ کیپٹل ازم کی اس امپائر کے لیے سستے مستری پیدا کرنا۔ جو بچہ سرکاری سکولوں سے پڑھا‘ وہ یہاں کے کیپٹل ازم کا کل پرزہ بنے گا۔ جو برائٹ بچہ ہے‘ جو ۱۲۵ اے گریڈ لے کر چھت توڑ دیتا ہے وہ یہاں کی ملٹی نیشنلز کا کل پرزہ بنے گا۔ترقی کرے گا تو گوگل یا مائیکروسافٹ کے ہیڈ آفس میں پہنچ جائے گا۔ پھر جو دجل اور ظالمانہ نظام ہے اس کا ایک انتہائی ادنیٰ کل پرزہ بن جائے گا۔ یہ آپ کی تعلیم ہے۔ بڑے برائٹ بچے ہوتے ہیں لمز کے اور آئی بی اے وغیرہ کے‘ وہ کیا کرتے ہیں؟ اکبر نے کہا تھا:ـ

سند مجھ کو ملی تو جل گئے واعظ لگے کہنے
خری کی ہوگئی تکمیل باقی صرف لدنا ہے

یعنی آپ کو جو سند ملی ہے تو آپ کا کھوتا پن مکمل ہوگیا۔تو ’’خری‘‘ کی تکمیل ہوگئی‘ باقی صرف لدنا ہے۔یعنی آپ کو جاب ہینڈلنگ کرنی ہے اور اس سسٹم میں ایک لدے ہوئے اونٹ کی طرح آپ کو فکس ہونا ہے۔تو یہ صورت حال ہے جدید تعلیم کی۔

اب ہمارے ہاں یہ تبدیلی کہاں سے آئی؟ ہمارے ہاں تبدیلی آئی استعمار کے ذریعے۔اگر ہم استعمار کے تحت نہ بھی آتے تب بھی ہوسکتا ہے اسّی‘ سو یا ڈیڑھ سو سال بعد ہمیں یہ سب کرنا پڑتا۔ایسا نہیں ہے کہ استعمار نہ آتا تو ہم اپنی جگہ پہ قائم رہتے۔ایسا ممکن نہیں تھا۔ہم بار بار کہتے ہیں ترکی میں جو تبدیلی آئی‘ زیادہ تر عالمِ اسلام میں تبدیلی آئی ہے بائی ان پوزیشن‘ گن پوائنٹ پہ آئی ہے۔البتہ کچھ جگہوں پہ امپورٹ سے بھی آئی ہے۔سلطنتِ عثمانیہ تھی‘ ترکی تھا‘ اس نے تو خود سے کیا۔وہ تو colonize نہیں ہوا۔تھوڑا ٹائم لگ جاتا‘ کچھ اپنی شرائط پر آپ لین دین کر لیتے لیکن ہوا یہ کہ آپ پر قابض ہوگئے اور سب کچھ ختم کر دیا۔انہوں نے کہا تھا کہ:ـ

دستار و پیراہن گم اور جیب و کیسا خالی
تہذیب مغربی نے ہم کو چھتار ڈالا

بالکل گھٹنوں پہ لے آئے‘ سب کچھ ختم کر دیا۔پھر نئے ادارے قائم کیے۔یہ ایک لمبی بحث ہے۔ڈاکٹر ناصر عباس صاحب نے اس پہ کافی لکھا ہے۔نوآبادیاتی نظام کے جو سب سے بڑے ہتھیار ہیں لوگوں کو مائل کرنے کے لیے وہ دو ہیں: زبان اور تعلیم۔انگریز نے یہاں جو کلاس پیدا کی اس کے لیے زبان کے ذریعے اور تعلیم کے ذریعے عمل کیا۔

میں نے ابھی تک اس موضوع کی اہمیت پر گفتگو کی ہے۔اہلِ مغرب کا تصوّرِ علم کیا ہے اور ہمارا کیا ہے؟ ان کا تصوّرِ تعلیم کیا ہے اور ہمارا کیا ہے؟ دوسرا ہے Integration function کہ ایک سسٹم میں ضم ہونا ہے۔ آپ کھپ جائیں۔ہر جگہ ایک رٹا ہے کہ مدارس کے بچوں کا کیا کرنا ہے۔جو اتنے بے تحاشا لوگ نکل رہے ہیں ان

کو مین سٹریم میں لانا ہے۔ یہ تو بالکل الگ سے ایک مخلوق بن گئے ہیں۔ ان کو انگریزی پڑھائیں‘ کمپیوٹر سکھائیں تا کہ یہ سماج میں integrate ہو سکیں۔ تیسرا differentiating function ہے کہ کچھ لوگ آگے ہوں گے‘ کچھ پیچھے۔ ایک تھنکر نے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ یہ جو ڈگریاں حاصل کرنے کا دورانیہ اتنا زیادہ کیا جاتا ہے وہ اس وجہ سے کہ اگر جلدی جلدی سے لوگ مارکیٹ میں آ جائیں گے تو کہاں سے کھپیں گے! یعنی یہ انہوں نے ایک safety valve لگایا۔ پانچواں selective function ہے کہ وہ جو Darwinian Theory of Natural Selection ہے کہ اس تعلیمی نظام کے ذریعے سے طبقات بھی بن جاتے ہیں۔ چھٹا propaedeutic function ہے‘ یعنی اس سسٹم کے پروردوں میں سے پھر آپ پڑھانے والے بھی نکال لیتے ہیں۔ یہ تبدیلی استعمار کے ذریعے آئی اور اس میں میری ناقص رائے میں جتنا سبب افکار بنے ہیں اتنا ہی سبب مشین بنی ہے۔ مشین نے جو تبدیلی پیدا کی ہے وہ بہت سے نظریات سے زیادہ ہے۔ C.S.Lewis نے کہا تھا کہ جدیدیت میں سب سے اہم چیز مشین ہے۔ اکبر کہتے ہیں کہ: ؎

ایک دن وہ تھا کہ دب گئے تھے لوگ دین سے
ایک دن یہ ہے کہ دین دبا ہے مشین سے

ہمارے ہاں جو مسئلہ ہے وہ میں چند نکات میں عرض کر دیتا ہوں۔ ایک یہ ہے کہ شخصی تعلیم ہوتی تھی۔ فرد اہم ہوتا تھا۔ استاد مرکز میں ہوتا تھا۔ استناد کی اہمیت تھی‘ کیونکہ ہمارا علم سند پہ کھڑا ہوا ہے۔ اب ادارہ سازی (institutionalization) ہے۔ اب ادارے کو اہمیت حاصل ہے۔ آج سے ۲۰۰ سال پہلے ایک عالم دین سے یہ سوال نہیں ہوتا تھا کہ آپ نے کہاں سے پڑھا ہے بلکہ یہ سوال ہوتا کہ آپ نے کس سے پڑھا ہے؟ عبدالباری فرنگی محلی ہوں‘ قاسم نانوتوی ہوں‘ احمد رضا خان صاحب بریلوی ہوں یا فضل حق خیرآبادی ہوں‘ ان کے سوانح عمری پڑھ لیں تو مختلف لوگوں سے پڑھ رہے ہیں۔ جس کو آج ہم مدرسہ کہتے ہیں‘ وہ بنیادی طور پر شخصی نظام تھا۔ آج آپ کسی بھی عالم سے پوچھیں تو پہلا سوال یہ ہے کہ آپ کہاں سے فارغ ہیں! وہ بتائیں گے کہ میں بنوری ٹاؤن سے فارغ ہوں‘ میں دار العلوم سے فارغ ہوں وغیرہ۔ یعنی وہ بندوں کا نام نہیں بتاتے۔ پہلے استاد تھا‘ وہ تو غائب ہو گیا۔ اب نظام سازی (systamization) اور تدریسی خاکے (lesson plans) وغیرہ ہیں‘ اسی لیے تو ہیں کہ آدمی کسی بھی وقت replace کرتے ہیں کیونکہ وہ تو ایک آپریٹس ہے۔ یعنی Modern Education is a technique۔ جس طرح سٹیٹ ایک ٹیکنیک ہے‘ اسی طرح یونیورسٹی بھی ایک ٹیکنیک ہے۔ اُسی طریقے سے انٹرنیٹ بھی ایک ٹیکنیک ہے۔ تو ہماری پوری زندگی ٹیکنیک سے چل رہی ہے۔ ایک اور بات یہ ہے کہ علم اور معاش کو آپس میں جوڑ دیا گیا‘ یہ پہلے نہیں ہوا تھا۔ پہلے لوگ معاش کے لیے فنون سیکھتے تھے‘ وہ علم نہیں تھا۔ علم تو کسی اور چیز کے لیے تھا‘ جس پر میں نے آپ کو ارسطو کی مثال دی تھی۔ بقول اقبال: ؎

وہ علم نہیں موت ہے احرار کے حق میں
جس علم کا حاصل ہو جہاں میں دو کف جو

پھر عقائد پر جو سب سے بڑا اثر پڑا وہ یہ کہ غیب جدید علم شہود کے دائرے سے باہر ہے۔ یہ سب سے بنیادی بات ہے۔ ؎

محسوس پر بِنا ہے علومِ جدید کی
اس دَور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش

اور بقول اکبرالٰہ آبادی ؎

منزلوں دُور اُن کی دانش سے خدا کی ذات ہے
خردبیں اور دُوربیں تک ان کی بس اوقات ہے

اور ؎

کیونکر خدا کے عرش کے قائل ہوں یہ عزیز!
جغرافیہ میں عرش کا نقشہ نہیں ملا

کسی چیز کے ہونے کا مطلب ہے اس کا مشہود ہونا' تو غیب تو علم سے نکل چکا ہے۔ اسی لیے ہمارے بچے جو انگلش اسکولوں میں پڑھتے ہیں ان کے سامنے جب معراج وغیرہ کا ذکر کیا جائے تو وہ مسکراتے ہیں۔ ابھی وہ اتنے شوخ نہیں ہوئے کہ بدتمیزی کر دیں لیکن ان کو لگتا ہے کہ معجزات وغیرہ کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ بقول اکبر ؎

نظر ان کی رہی کالج کے بس علمی فوائد پر
گرا کے چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر
طریقِ مغربی کی کیا یہی روشن ضمیری ہے
خدا کو بھول جانا اور مہرِ ماسوا ہونا!

یعنی اب جیسے یہی تعلیم ہے اور یہی علم ہے۔ ہمارے ہاں جو بہت برائٹ بچہ ہوتا ہے اس کے ساتھ کیا ہوتا ہے' اس بارے میں اکبر کہتے ہیں: ؎

قابلیت تو بہت بڑھ گئی ماشاءاللہ
مگر افسوس یہی ہے کہ مسلماں نہ رہے!

اللہ تعالیٰ ہم سب کے حال پر رحم کرے۔

سوال و جواب

سوال: جدید تعلیم نے ہمارے عقائد کو کیسے متاثر کیا؟

جواب: جدید تعلیم کا ہمارے عقائد پر جو اثر پڑا ہے اُس کا بنیادی سبب جدید علم کی ساخت ہے۔ جدید علم حواس مرکز ہے' شہود مرکز ہے۔ اُس میں غیب کے لیے گنجائش نہیں ہے' اسی لیے ہمارے ہاں عام طور پہ جب بھی اسلامک ایجوکیشن کی یا اسلامک اسکولنگ کی بات ہوتی ہے تو زیادہ تر گفتگو نصاب پر ہوتی ہے کہ اس میں کچھ بہتری لائی

جائے اور دینیات کا پہلو بڑھا دیا جائے۔ مثلاً سائنسز چاہے وہ فزیکل ہوں یا سوشل‘ عمومی خیال یہ ہوتا ہے کہ وہ تو واقعاتی اور matter of fact ہیں‘ اُس میں کچھ چیزیں شامل کر دی جائیں تو کام بن سکتا ہے۔ البتہ جس کو آپ matter of fact کہہ رہے ہیں‘ اُس میں بہت سے مسئلے ہیں۔

پھر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مذہب اور سائنس میں کوئی conflict نہیں ہو سکتا۔ مولانا عبدالباری ندوی صاحب نے بہت پہلے ایک کتاب لکھی تھی ''مذہب اور سائنس''۔ اُنھوں نے ایک تشبیہ بیان کی تھی کہ مذہب اور سائنس میں تصادم کا مطلب ایسے ہی ہے جیسے بحری جہاز اور ٹرین میں ٹکر ہو جائے یا ہوائی جہاز اور سائیکل میں ٹکر ہو جائے۔ گویا دونوں کے دائرے بالکل الگ الگ ہیں۔ میری ناقص رائے میں content سے زیادہ اہم جدید تعلیمی اسٹرکچر ہے‘ جو آپ کو گائیڈ کرتا ہے۔ ہم ایک جملہ طالب علموں سے کہتے ہیں اور وہ جملہ اگر سمجھ میں آ جائے تو جدید دنیا کی بہت سی چیزیں کھل جائیں گی۔ وہ جملہ مارشل مکلوہن کا ہے اور بڑا سادہ سا لیکن گہرا جملہ ہے۔ اُس نے کہا تھا: The medium is the message۔ جس ذریعے سے آپ کوئی چیز ڈیلیور کر رہے ہیں یا حاصل کر رہے ہیں‘ وہ ذریعہ بہت اہم ہے۔ مثلاً جدید دور میں دورۂ حدیث شریف منعقد ہوتا ہے تو ہمارے علماء جدید کیوں نہیں ہو رہے؟ وہاں یہ جدید ٹیکنالوجی کیوں نہیں استعمال ہو رہی؟ پروجیکٹر کیوں نہیں استعمال کرتے؟ پاور پوائنٹ پر حدیثوں کا تجزیہ آنا چاہیے‘ علیٰ ہذا القیاس۔ دراصل یہ سمجھنا چاہیے کہ حدیث کا علم اِس اسٹرکچر کے ساتھ conducive نہیں ہے۔ اُس علم میں تو میز کرسی بھی مسئلہ بنے گی۔ ہر علم کو حاصل کرنے کا ایک پروٹوکول ہے‘ ایک طریقہ ہے۔ ہر میڈیم ہر علم کے لیے سازگار نہیں ہے۔

اسی طرح اسلامک اسکولز کا تصور ہے۔ اسکولز ہیں‘ کالجز ہیں‘ پھر یونی ورسٹیز ہیں۔ آپ اس میں زیادہ سے زیادہ یہ کریں گے کہ کچھ دعائیں ڈال دیں‘ تھوڑے بہت اذکار اور کلمے یاد کرا دیے‘ آداب رٹوا دیے‘ ویلنٹائنز ڈے نہیں منایا جائے گا‘ ہیلووین نہیں منائی جائی گی‘ خواتین اساتذہ ڈھنگ کا لباس پہنیں گی۔ اچھی بات ہے‘ لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ آپ نے لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو تعلیم دینی ہے‘ اِس بات پر کیوں سوال نہیں اٹھتے کہ لڑکیوں اور لڑکوں کا نصاب ایک کیوں ہے؟

سوال: بظاہر روایتی تعلیمی نظام میں عورت کو دنیوی تعلیم حاصل کرنے کے مواقع نہیں تھے لیکن اب جیسے عورتوں کو آگے بڑھنے کے مواقع دیے جاتے ہیں‘ اِس معاملے میں ہمارا کیا نقطۂ نظر ہونا چاہیے؟

جواب: آپ مجھ سے پوچھیں تو میں کہوں گا کہ بچیوں کو تو رہنے دیں‘ ہمارے بچوں کو بھی یہ تعلیم حاصل نہیں کرنی چاہیے۔ یہاں بھی ہمیں اکبر یاد آتے ہیں‘ اُنھوں نے کہا تھا:

دو اسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم
قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

تعلیمِ دختراں سے یہ امید ہے ضرور
ناچے دلہن خوشی سے خود اپنی برات میں

اور یہ بات تو ہمارے مشاہدے کی ہے۔ ہم نے کچھ ایسے اداروں میں پڑھایا ہے جو بہت ٹیڑھے میڑھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائیں' وہاں جو بچیاں پڑھتی ہیں' اُن کو دیکھ کر ہی یہ یقین ہو جاتا ہے کہ یہ بیوی بننے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ اِن میں تسلیم کی صفت ہے ہی نہیں' انھیں تو قدم سے قدم ملا کر چلنا ہے۔ آپ دیکھ نہیں رہے کہ لاکھوں کروڑوں لگا کر شادیاں ہوتی ہیں لیکن کوئی ہفتے چل رہی ہے' کوئی مہینے چل رہی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ازدواجی رشتہ ایسے مزاج کے ساتھ نہیں چلتا۔

سوال: آپ نے سائنس کے حوالے سے بات کی' میں خود سائنس کا استاد ہوں۔ عموماً فلسفے کے اساتذہ سائنس سے ناواقف ہوتے ہیں' اس لیے وہ یہ بات ضرور کرتے ہیں کہ سائنس مذہب سے دور کرتی ہے' لیکن میں سمجھتا ہوں کہ سائنس تو مذہب سے قریب کرتی ہے۔ یعنی جتنی سائنس قرآن میں بیان کی گئی ہے دوسری جگہ نہیں ہے' صرف relate کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے دینی اساتذہ کرام ناواقفیت کی وجہ سے اُس کے ساتھ تعلق قائم نہیں کر پاتے۔

جواب: ایک ہے پاپولر سائنس جو ہمارے ہاں بیان ہوتی ہے' اور ایک ہے سائنس کی تھیوری۔ سائنس کی ایک تعریف جو عرصے سے چلی آ رہی ہے وہ verification ہے۔ تجربے کے ذریعے جس چیز کی تصدیق ہو جائے وہ سائنس سے ثابت ہے۔ کارل پوپر وغیرہ کے بعد اب تعریف یہ ہو گئی کہ falsification سائنس کی بنیاد ہے۔ جس چیز کی تلبیس ہو سکے وہ سائنس ہونا qualify کرتی ہے۔ چنانچہ خدا' آخرت' فرشتے' روح' جنت' جہنم یہ non-falsifiable ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سائنٹفک نہیں ہیں تو ان کا ہونا' نہ ہونا برابر ہے۔ آج ایک تھیوری آئی ہے' وہ کسی مذہبی چیز کا اثبات کر رہی ہے' ہوسکتا ہے کل وہ بدل جائے۔ نیوٹن کی فزکس اور تھی' آئن سٹائن کی اور ہے' آئزن برگ کی اور ہے۔ اب ہم اگر اس میں پڑ جائیں کہ سائنس کی جو نئی تحقیقات سامنے آئیں' ہم کہیں کہ قرآنِ مجید میں اِس کا بیان ہے اور تیس چالیس سال بعد وہ تھیوری جھوٹی ثابت ہو جائے' پھر ہم خالی ہاتھ بیٹھے رہیں۔ یہ بہت سلپری سلوپ ہے۔ ''مذہب اور سائنس'' یا ''قرآن اور سائنس'' بہت حساس موضوع ہے۔ ہم بہت سی چیزوں کو بہت جلدی قبول کر کے اور اُس کی مرعوبیت میں آ کر اللہ کی کتاب سے اُس کو relate کرنے کی کوشش کرتے ہیں' اس سے ہمارا مذاق اڑتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ دنیا بھر میں سائنس دان محنتیں کر کر کے' سر مار مار کے کوئی چیز دریافت کرتے ہیں' یہ مولوی آرام سے بیٹھ کر کہتے ہیں کہ یہ تو قرآن میں پہلے سے ہی تھا۔ اگر پہلے سے ہی تھا تو آپ کس خوابِ غفلت میں تھے؟ آپ کیوں نہیں برآمد کر سکے؟ قرآن تو آپ کے پاس تھا۔ لہٰذا اِس میں تھوڑی سی احتیاط کرنی چاہیے۔

❁❁❁

مباحثِ عقیدہ (۱۹)

مؤمن محمود

نبوت ورسالت کا دارومدار: اللہ تعالیٰ کی صفتِ کلام

اللہ تعالیٰ کی صفت کلام پر نبوت ورسالت کا دارومدار ہے۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ کا متکلم ہونا ثابت ہوگا تو رسول کی رسالت ثابت ہوگی' کیونکہ رسول کی رسالت کا مطلب ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے رسول کی زبانی اپنا کلام پہنچایا۔ گویا صفت کلام کا ثبوت اس بات کے لیے ضروری ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ مخلوق سے گفتگو کرتے ہیں۔ مخلوق تک اپنا پیغام پہنچاتے ہیں اور انہیں مکلف وجود بناتے ہیں۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے جب بچھڑے کی عبادت کی تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس بچھڑے کے معبود نہ ہونے کے جو دلائل دیے ان میں سے ایک دلیل یہ تھی:

﴿اَفَلَا یَرَوْنَ اَلَّا یَرْجِعُ اِلَیْهِمْ قَوْلًا ۙ وَّلَا یَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ﴾ (طٰہٰ)

''کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ یہ بچھڑا ان کی طرف کوئی بات لوٹا تا نہیں ہے (ان سے کلام نہیں کرتا' ان سے خطاب نہیں کرتا) اور نہ ان کے لیے ضرر اور نفع کا اختیار رکھتا ہے۔''

گویا اللہ سبحانہ وتعالیٰ یہ بتا رہے ہیں کہ نفع اور ضرر کا مالک ہونا خود اللہ کے لیے ضروری ہے۔ اسی طریقے پر صفت کلام اور قول اور خطاب کرنا بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بنیادی صفات میں سے ہے۔ صفتِ کلام کے ثبوت کے لیے امام الحرمین ابوالمعالی الجوئینی علیہ الرحمۃ اور امام الغزالی علیہ الرحمۃ نے جو طریق عقلیہ اختیار کیا وہ بھی ہم نے دیکھا کہ کیوں رسالت کی ضرورت ہے۔

وحی اور کلام اللہ کی حاجت: امام رازیؒ کا استدلال

امام الرازی علیہ الرحمۃ نے آیات زیر مطالعہ کے مابین ایک بہت خوب صورت ربط بیان کیا ہے۔ یعنی ﴿اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ۝﴾ سے گفتگو شروع ہو رہی ہے:

﴿اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ﴿۵۸﴾ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿۵۹﴾﴾ (الواقعۃ)

''کیا تم نے غور کیا کہ جو نطفہ تم ٹپکاتے ہو! کیا تم اس کے خالق ہو یا ہم خالق ہیں؟''

وہ فرماتے ہیں کہ جتنی باتیں ہوئی ہیں ان پر اگر غور کیجیے تو پہلے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انسان کے جسدی وجود کا ذکر فرمایا' اس کی ابتدا کا ذکر فرمایا اور وہ ایک نطفہ سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد انسان کی بقا کا جتنا بھی سامان ہے وہ زمین سے آتا ہے۔ چنانچہ آگے فرمایا:

﴿اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ﴿۶۳﴾ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ﴿۶۴﴾﴾

’’کیا تم نے کبھی غور کیا کہ یہ بیج جو تم بوتے ہو! کیا تم اسے اُگاتے ہو یا ہم اُگانے والے ہیں؟‘‘

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ پانی انسان کی بنیادی حاجت ہے:

﴿اَفَرَءَیۡتُمُ الۡمَآءَ الَّذِیۡ تَشۡرَبُوۡنَ ﴿۶۸﴾ ءَاَنۡتُمۡ اَنۡزَلۡتُمُوۡہُ مِنَ الۡمُزۡنِ اَمۡ نَحۡنُ الۡمُنۡزِلُوۡنَ ﴿۶۹﴾﴾

’’کبھی تم نے غور کیا کہ وہ پانی جو تم پیتے ہو! کیا بادلوں سے تم نے اسے برسایا ہے یا ہم ہیں برسانے والے؟‘‘

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ غذا جو پانی اور زمین سے حاصل ہوتی ہے‘اس کو پکانے کے لیے آگ ضروری ہے:

﴿اَفَرَءَیۡتُمُ النَّارَ الَّتِیۡ تُوۡرُوۡنَ ﴿۷۱﴾ ءَاَنۡتُمۡ اَنۡشَاۡتُمۡ شَجَرَتَہَاۤ اَمۡ نَحۡنُ الۡمُنۡشِـُٔوۡنَ ﴿۷۲﴾﴾

’’کبھی تم نے سوچا کہ وہ آگ جو تم جلاتے ہو! کیا اس کے درخت کو تم نے پیدا کیا ہے‘ یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہیں؟‘‘

یعنی آگ کا بیان ہوگیا۔ فرماتے ہیں کہ ان آیات (۶۳۔۷۲) میں انسان کی ابتدا اور پھر اس کی بقا کا جتنا سامان ہوسکتا ہے اس کا بیان فرمادیا گیا لیکن یہ ابتدا اور بقا سب جسدی ہے۔ یعنی ہمیں زمین سے اپنے جسد کی بقا کے لیے غذا‘ پانی اور آگ کی حاجت ہے اور ہمارے وجود کی ابتدا نطفے سے ہوتی ہے۔ یہ باتیں بیان کرنے کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ چونکہ انسان کا اصل وجود جسدی نہیں بلکہ وہ تو روح ہے جو اللہ کی طرف سے پھونکی گئی ہے‘ لہٰذا اس کی ربوبیت کا بیان فرمانے سے پہلے قسم کھائی ہے:

﴿فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوۡمِ ﴿۷۵﴾﴾

’’پس نہیں! قسم ہے مجھے اُن مقامات کی جہاں ستارے ڈوبتے ہیں۔‘‘

یعنی جس طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ تمہارے جسد اور اس کی بقا کی ربوبیت کا سامان بہم پہنچا رہا ہے اسی طریقے پر اس نے تمہارے اصلی وجود کی تربیت کا اہتمام بھی فرمایا ہے۔ وہ اصل وجود تمہاری روح ہے اور وہ اہتمام وحی ہے‘ وہ کلام اللہ ہے۔ لہٰذا یہ ساری باتیں تو ہمارے سامنے ہیں کہ ہم کھاتے ہیں‘ پیتے ہیں‘ دیکھتے ہیں۔ لیکن کیا کلام اللہ یعنی قرآن مجید ہماری اس طرح کی حاجت ہے کہ نہیں‘ یہ بات پردے میں ہے۔ اگر ہم کھائیں گے نہیں تو مر جائیں گے لیکن اگر قرآن کی تلاوت نہیں کریں گے یا اللہ کے کلام سے استفادہ نہیں کریں گے تو وقتی طور پر کچھ بھی نہیں ہوگا۔ بہر حال وہاں قسم کھائی ہے‘ باقی جگہوں پر قسم نہیں کھائی۔ چنانچہ فرمایا:

﴿فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوۡمِ ﴿۷۵﴾﴾

’’پس نہیں! قسم ہے مجھے اُن مقامات کی جہاں ستارے ڈوبتے ہیں۔‘‘

﴿وَ اِنَّہٗ لَقَسَمٌ لَّوۡ تَعۡلَمُوۡنَ عَظِیۡمٌ ﴿۷۶﴾﴾

’’اور یقیناً یہ بہت بڑی قسم ہے اگر تم جانو!‘‘

کس بات کا اثبات مقصود تھا‘ مقسم علیہ کیا ہے؟ ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّہٗ لَقُرۡاٰنٌ کَرِیۡمٌ ﴿۷۷﴾ فِیۡ کِتٰبٍ مَّکۡنُوۡنٍ ﴿۷۸﴾ لَّا یَمَسُّہٗۤ اِلَّا الۡمُطَہَّرُوۡنَ ﴿۷۹﴾﴾

’’یہ قرآن ایک عزت والی کتاب ہے‘ ایک پوشیدہ یا چھپی کتاب (لوحِ محفوظ) میں درج ہے۔ اس تک نہیں

پہنچ سکتے مگروہی جو بہت زیادہ پاک صاف ہیں (یا جن کو پاک صاف کر دیا گیا ہے)۔''
خود پاک صاف ہو کر انسان نہیں پہنچ سکتا جب تک اللہ کی توفیق شامل حال نہ ہو اور اللہ ہی مطہر نہ ہو' پاک صاف نہ کرے۔ آگے فرمایا:

﴿تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٨٠﴾﴾
''یہ ربّ العالمین کی طرف سے اتارا گیا ہے۔''
﴿اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ﴿٨١﴾﴾
''کیا اس کلام سے تم غفلت برتتے ہو۔''
﴿وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ﴿٨٢﴾﴾
''اور اپنا نصیب یہ بناتے ہو کہ تم اسے جھٹلاتے ہو!''

گویا یہاں بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کلام اللہ (وحی) کی حاجت کا بیان فرما رہے ہیں کہ جس طرح تمہارے جسدی وجود کی بقا کے لیے سامان وافر پہنچایا ہے اسی طریقے پر تمہارے روحانی وجود کی بقا کا اہتمام بھی قرآن مجید کی صورت میں فرمایا۔ امام الرازیؒ نے یہ ربط بیان فرمایا اور اس کے ذریعے سے استدلال فرمایا کہ وحی اور کلام اللہ کی حاجت کیا ہے۔

کلامِ نفسی اور کلامِ لفظی

صفتِ کلام اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ازلی اور وجودی صفت ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ آمر اور ناہی ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے اللہ سبحانہ وتعالیٰ انسان کو مکلف کرتے ہیں' خبر دیتے ہیں۔ لفظ کلام کے دو اطلاقات ہیں۔ ان دو اطلاقات میں سے حقیقت کیا ہے' مجاز کیا ہے؟ ایک اطلاق ہوتا ہے کلام پر نطق کا جو ہم بولتے ہیں۔ جو ہمارے منہ سے آواز نکلتی ہے' الفاظ نکلتے ہیں یا الفاظ لکھتے ہیں اس پر بھی کلام کا اطلاق ہوتا ہے۔ کلام کا دوسرا اطلاق ہے ان معنی پر کہ جو ابھی الفاظ کا لبادہ اوڑھنے سے پہلے ہمارے اندر موجود ہیں۔ اس کو اہلِ منطق نطق داخلی کہتے ہیں۔ یعنی جب وہ بولتے ہیں کہ ہم انسان کو حیوانِ ناطق کہتے ہیں تو اس سے مراد اُن کی یہ نہیں ہوتی کہ بولنے والا حیوان' کیونکہ جو گونگا ہے (بول نہیں سکتا) وہ بھی حیوانِ ناطق ہے۔ ارسطو نے rational animal کی اصطلاح استعمال کی' جس میں یہ والی گویائی مراد نہیں تھی بلکہ مراد تھی نطق باطنی۔ اہل منطق اس سے مراد لیتے ہیں کہ جس کو نطق باطنی حاصل ہے' جس کو کلامِ نفسی حاصل ہے' جس کو کلام داخلی حاصل ہے' جس کے اندر معنی موجود ہیں' جس کے اندر تعقل کی صلاحیت ہے' جس کے اندر تجرید کی صلاحیت ہے۔ جیسے ایک بچپن سے گونگا ہے' اس نے کبھی کوئی لفظ نہیں سنا ہوتا' کیونکہ وہ بہرا بھی ہوتا ہے لیکن پھر بھی اس کے اندر معنی تو ہوتے ہیں جن کو وہ کسی طریقے پر پہنچا دیتا ہے۔ لہٰذا وہ متکلم ہوتا ہے۔ وہ اگرچہ بول نہیں سکتا' وہ نطق ظاہری نہیں رکھتا لیکن اس کے اندر صفت کلام یعنی کلامِ نفسی پایا جاتا ہے۔

جو معانی انسان کے اندر ہوتے ہیں دراصل یہ کلام کی حقیقت ہے یا نطق ظاہری کلام کی حقیقت ہے' اس میں

اہلِ سُنّت اور معتزلہ کے درمیان اختلاف ہوگیا۔ اہلِ سُنّت نے کہا کہ لفظ کلام کا اطلاق کلام نفسی پر حقیقتاً جبکہ کلام لفظی پر مجازاً ہوتا ہے۔ معتزلہ نے کہا کہ نہیں، کلام کی حقیقت کلامِ لفظی کی ہے، کلام نفسی کی نہیں۔ لہٰذا انہوں نے کلام نفسی کو ماننے سے انکار کر دیا۔ لفظ تو بہر حال مخلوق ہوتا ہے، صوت مخلوق ہے۔ لہٰذا جب قرآن کا اطلاق انہوں نے صرف کلام لفظی پر کیا تو ان کا ایک موقف یہ بنا کہ یہ کلام مخلوق ہے۔ لہٰذا ان کا مشہور قول ہے: ''کلام اللہ مخلوق''، یعنی یہ اللہ کا کلام ہے اور یہ مخلوق ہے جس کی نفی سلف اور خلف نے کی ہے۔ سلف سے بھی بہت سے اقوال ملتے ہیں۔ ایک صاحب کو سیدنا عمرؓ یا کسی اور صحابی نے دیکھا کہ وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے خطاب کر رہے ہیں: یارب القرآن! ''اے قرآن کے ربّ!'' انہوں نے منع فرمایا کہ تم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو یہ نہ کہو کہ وہ قرآن کا ربّ ہے بلکہ قرآن تو اسی سے ہے، یعنی اس کی صفتِ کلام ہے۔ جب معتزلہ نے لفظ اور صوت کو صفت کلام قرار دے دیا تو قرآن مخلوق ہوگیا۔ اہل سنت نے کہا کہ ہم تمہاری آدھی بات کو مانتے ہیں کہ صوت یعنی آواز اور الفاظ کیونکہ ان کے اندر ترکیب، تقدیم، تاخیر، تغیر ہے تو یہ سب باتیں بتا رہی ہیں کہ یہ حادث ہوتا ہے۔ یعنی اصوات اور الفاظ قدیم نہیں ہوتے کیونکہ یہ بہر حال انسانی زبان ہے اور انسان کے ساتھ وجود میں آئی ہے۔ اتنا قول تمہارا درست ہے کہ یہ ساری باتیں حادث ہیں لیکن قرآن کا اطلاق صرف صوت اور لفظ پر نہیں ہوتا بلکہ یہ صوت اور لفظ تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے کلام نفسی پر دلیل ہیں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کلام نفسی قدیم ہے۔ لہٰذا قرآن مجید اس معنی میں مخلوق نہیں ہے۔ لہٰذا اہلِ سُنّت کا قول یہ بنا: کلام اللہ غیر المخلوق ۔ ''اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کلام غیر مخلوق ہے۔''

البتہ معتزلہ اور اہلِ سُنّت ایک بات پر جمع ہیں کہ الفاظ، حروف اور اصوات قدیم نہیں ہوتیں، یہ حادث ہی ہوتی ہیں۔ اس کے بعد اختلاف کلام نفسی کے اثبات پر واقع ہو رہا ہے۔ معتزلہ کلام نفسی کا اثبات نہیں کر رہے، اہلِ سُنّت کلام نفسی کا اثبات کر رہے ہیں اور اس کو اللہ کی صفت قدیمہ کہتے ہیں۔ اسے غیر مخلوق مانتے ہیں کیونکہ اللہ کی کوئی صفت مخلوق نہیں ہوتی۔ چنانچہ قرآن مجید اللہ کی بعض صفت نفسی پر دلیل ہے، سب صفت نفسی پر دلیل نہیں، کیونکہ صفت نفسی میں تو علوم کی کثرت ہے۔ قرآن مجید بعض علوم پر یعنی بعض معانی پر جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علم قدیم میں پائے جاتے ہیں، ان پر دال ہے اور جو مدلول ہیں وہ صفت نفسیہ ہیں، وہ کلام قدیم ہے۔ یعنی معتزلہ اور اہلِ سُنّت کے درمیان جو مختلف فیہ مسئلہ ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔ اس خلاصے میں محل نزاع یہ ہے کہ صفت نفسیہ، کلام نفسی، نطق نفسی کا اثبات اور عدم اثبات۔ اہلِ سُنّت کے ہاں اس کا اثبات کیا گیا جبکہ معتزلہ کے ہاں اس کا اثبات نہیں کیا گیا۔

مجسمہ کا موقف

ایک تیسرا گروہ ہے جس کو ہماری تاریخ میں مجسمہ اور مشبہ کہتے ہیں۔ ہر مجسم مشبہ ہے لیکن ہر مشبہ مجسم نہیں۔ تشبیہ ذرا ہلکی ہوتی ہے، اس میں آگے بڑھتے چلے جائیں تو وہ تجسیم میں بدل جاتی ہے۔ تشبیہ یہ ہے کہ اللہ کی بعض صفات کو یا مخلوق کی بعض صفات کو اللہ کے مانند قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس میں آگے بڑھتے چلے جائیں اور اللہ کو

بھی جسد قرار دے دیں، جسم قرار دے دیں تو یہ تشبیہ اپنی آخری حدود کو پہنچ جاتی ہے جسے تجسیم کہتے ہیں۔ تجسیم کو ماننے والے گروہ کو مجسمہ کہا جاتا ہے اور تشبیہ جو ذرا ہلکے درجے پر رہ گیا ان کو مشبہ کہتے ہیں۔ یہ وہ گروہ ہیں جو اہلِ سُنّت سے خارج ہیں۔ ان کے ہاں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات محلِ حوادث ہوسکتی ہے، یعنی اللہ کی ذات میں بھی تغیر ہوسکتا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ خود بھی اپنی ذات میں تغیر کرسکتا ہے کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو انسانوں پر قیاس کیا اور تجسیم کے قائل ہوئے۔ ان کے ہاں اس میں کوئی مسئلہ نہیں ہے کہ اللہ کا کلام جو غیر مخلوق ہے وہ حرفی بھی ہو، صوتی بھی ہو، لفظی بھی ہو۔ انہوں نے کہا کہ ہم معتزلہ کے ساتھ ہیں کہ کلام تو ہوتا ہی ظاہری نطق ہے۔ کلام لفظی ہی کلام ہوتا ہے۔ ہم اس کلام لفظی کو بھی قدیم مانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ صوت یعنی آواز اور الفاظ سے کلام کرتا ہے جس طرح انسان الفاظ اور اصوات سے کلام کرتا ہے۔ اس کلام کی وجہ سے اگر تم کہتے ہو کہ ذات میں تغیر ہو رہا ہے تو ہمیں ان باتوں سے کوئی غرض نہیں ہے۔ اس سے کچھ بھی نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان باتوں کا اثبات کیا۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴿١٦٤﴾﴾ (النساء)

''اور موسیٰؑ سے تو کلام کیا اللہ نے جیسے کہ کلام کیا جاتا ہے۔''

اور:

﴿وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ۭ﴾ (الاعراف:۱۴۳)

''اور ان سے کلام کیا ان کے ربّ نے، انہوں نے درخواست کی کہ اے میرے پروردگار! مجھے یارائے نظر دے کہ میں تجھے دیکھوں۔''

اور:

﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا﴾ (الشوریٰ:۵۱)

''اور کسی بشر کا یہ مقام نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے سوائے وحی کے یا (پھر وہ بات کرتا ہے) پردے کی اوٹ سے یا وہ بھیجتا ہے کسی پیغام بَر (فرشتے) کو''

تو تمہارا یہ کہنا کہ کلام تو قدیم ہوتا ہے، وہ کس طرح سنا جائے گا، یہ باتیں سمجھ نہیں آسکتیں۔ ہم تو سادہ سی بات مانتے ہیں کہ جس طرح ہم ایک دوسرے سے بولتے ہیں، جس طرح میں بول رہا ہوں اور آپ لوگ سن رہے ہیں اور آپ کو سمجھ آ رہی ہے اسی طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ بھی کلام فرماتے ہیں۔

اللہ کی صفتِ کلام کو انسانوں کے کلام پر قیاس نہیں کیا جاسکتا

اہلِ سُنّت نے کہا کہ یہ فضول باتیں نہ کہو، یہ بالکل سادہ سا تصور ہے اور وہی ہے قیاس الغائب علی الشاہد۔ تم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو مخلوق پر قیاس کر رہے ہو۔ جب ہم جان چکے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنی ذات وصفات میں کسی کے مانند نہیں ہیں ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ﴾ (الشوریٰ:۱۱) تو وہ اپنے کلام میں بھی کسی کے مانند نہیں ہیں۔ لہٰذا ان کا کلام یوں نہ سمجھ لینا کہ وہ تمہاری طرح کے حروف اور اصوات سے مل کر بنتا ہے۔ اللہ کا کلام اس سے ماوراء

ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ کلامِ نفسی کے بارے میں جو ہم نے انسانوں کی مثال دی ہے تو یہ جان لو کہ ہم اللہ میں اس طرح کا کلامِ نفسی ثابت نہیں کر رہے کیونکہ یہ کلامِ نفسی بھی حادث ہوتا ہے۔ اچانک میں نے سوچنا شروع کر دیا تو یہ کلامِ نفسی حادث ہے۔ ہم تمہیں صرف سمجھانے کے لیے یہ بتا رہے ہیں کہ کلامِ نفسی اور کلامِ لفظی میں تمہارے ہاں بھی فرق ہے۔ بس یہ فرق دکھا رہے ہیں کہ اللہ کے کلام کو کلامِ لفظی نہ سمجھنا۔ باقی اس کا جو کلامِ نفسی ہے وہ بھی انسان کے کلامِ نفسی سے ماوراء ہے۔ وہاں بھی کوئی تقدیم و تاخیر اور سوچ بچار نہیں ہے جس طرح ہم سوچ بچار کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں جس کو حدیثِ نفس کہا جاتا ہے کہ اپنے سے بیٹھ کر باتیں کرنا' یہی کلامِ نفسی ہے تو وہاں اس طرح کی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن یہ مثال اور تشبیہ دی ہے محض معتزلہ کو بتانے کے لیے کہ دیکھو انسان میں بھی کلامِ نفسی اور کلامِ لفظی ایک نہیں ہوتا۔ پھر معتزلہ نے اس پر ایک دلیل دی۔ انہوں نے کہا کہ جب تم اپنے سے بیٹھ کر گفتگو کرتے ہو تب بھی الفاظ کے ساتھ ہی کر رہے ہوتے ہو' یعنی وہ معنی الفاظ اور حروف کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ الفاظ معانی مجرد نہیں ہوتے بلکہ الفاظ کے پیرائے میں ڈھلے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کا جواب اہلِ سُنّت نے دیا کہ چونکہ ہم الفاظ کے ساتھ گفتگو کرنے میں بہت زیادہ مانوس ہو چکے ہیں تو ہمارے لیے یہ بس ایک خلافِ عادت ہے' یعنی یہ کوئی مستحیل بات نہیں ہے کہ ہم اپنے آپ سے الفاظ کے بغیر معانی کا بیان کر سکیں۔ باقی جہاں تک وہ شخص ہے جو بچہ ہے جس نے ابھی تک الفاظ نہیں سیکھے' بات تو اس کے اندر بھی ہے جو وہ پہنچاتا ہے۔ سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ جو اخرس ہے' بچپن سے اس نے کوئی لفظ نہیں سنا اور وہ بول بھی نہیں سکتا تو اس کے اندر بھی کلامِ نفسی پایا جاتا ہے۔ بہر حال اہل سنت نے کلامِ نفسی کا اثبات کیا اور کلامِ لفظی کو مخلوق کہا۔ یعنی کلامِ نفسی صفت قدیمہ ہے جو غیر مخلوقہ ہے۔ جہاں تک الفاظ اور اصوات ہوتے ہیں اور جہاں تک زبان ہے تو یہ سب باتیں مخلوق ہیں۔ اس حد تک ان کا معتزلہ سے اتفاق ہے اور صفت نفسیہ کے اثبات پر اختلاف ہے۔

قرآن کلام اللہ اور اس کے معانی قدیم

اب یہاں سے جو بات آپ کو سمجھ میں آئی ہوگی' اور یہی وہ بات ہے جس کے بارے میں کہا گیا کہ چونکہ سمجھ کئی دفعہ نہیں آتی تو عوام الناس کے سامنے بیان نہیں کرنی چاہیے' اور ہم نے بھی یہ بات عوام الناس کے سامنے بیان نہیں کرنی کہ جو کلام اللہ اس وقت ہمارے سامنے ہے اس میں جو حرف اور صوت ہے اس کو اہلِ سُنّت قدیم نہیں مانتے۔ قدیم اسی کو مانتے ہیں جو اس کے اندر معانی ہیں' جو اللہ کی صفت کلام ہے۔ البتہ یہ نہیں کہہ رہے کہ یہ الفاظ اللہ کے رسول ﷺ کے ہیں۔ نعوذ باللہ! بلکہ اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ نظم اور معانی دونوں اللہ کی طرف سے ہیں۔ القرآن کلام اللہ لفظاً و معنًا۔ معناً تو وہ صفت نفسیہ ہے' لفظاً کا مطلب ہے کسی انسان نے یہ لفظ بنا کر نہیں بھیجے بلکہ اللہ ہی نے اس طرح اتارا ہے۔ یعنی الفاظ بھی اللہ نے اتارے ہیں لیکن اپنی مخلوق کی حیثیت سے جبکہ کلام جو اس کے اندر صفت قدیمہ یا معانی ہے وہ غیر مخلوق ہے۔ البتہ دونوں اللہ کی طرف سے ہیں۔ تو اس میں کوئی انسانی دخل یا انسانی ہاتھ نہیں ہے بلکہ نظم (الفاظ) اور معانی دونوں اللہ کی طرف سے نازل ہوئے

ہیں۔ اس میں کسی قسم کا کوئی اختلاف اہل سنت کے ہاں نہیں ہے۔ اختلاف وہی ہے جتنا بیان کر دیا گیا۔

امام احمد بن حنبلؒ کا موقف

عباسی خلیفہ معتصم باللہ اور اس سے پہلے امین الرشید کے زمانے میں اکثر علماء خاموش ہو گئے تھے۔ احمد بن ابی دعات‘ ایک بہت بڑے معتزلی عالم تھے‘ جن کا اثر ورسوخ خلفاء پر بہت زیادہ تھا۔ ان کی وجہ سے دوسرے معتزلی علماء اور ریاست یا خلفاء نے اعتزال کو ایک آفیشل مذہب کے طور پر اختیار کر لیا اور ریاستی قوت سے بالجبر اس کو نافذ کرنے کی کوشش کی۔ اس میں ایک مسئلہ جو مختلف فیہ بنا‘ انہوں نے ایک امتحانی سوال بنایا کہ: ماذا تقول فی کلام اللہ ؟ ’’اللہ کے کلام کے بارے میں تم لوگ کیا کہتے ہو؟‘‘ جو کہتا تھا کہ المخلوق! تو وہ کہتے تھے کہ ٹھیک ہے ہمارے عقیدے پر ہے‘ تو اسے چھوڑ دیتے تھے۔ جو نہیں مانتا تھا‘ اس کو سزا دی جاتی تھی۔ وہ محنۃ تھا۔ بڑے بڑے علماء کے ساتھ اس طرح ہوتا رہا ہے۔ ’’محنۃ الامام احمد بن حنبل‘‘ پر کتب تصنیف کی گئیں۔ چنانچہ وہ کھڑے ہو گئے اور انہوں نے جو دلیل اختیار کی وہ یہ نہیں تھی بلکہ وہ کہتے تھے: ایتونی بکتاب اللہ او سنۃ نبیہ اقول بہ ! ’’میرے پاس اللہ کی کتاب اور اُس کے نبی کی سنّت میں سے کوئی شے لے آؤ تو میں کہہ دوں گا۔‘‘ یعنی وہ اصلاً عقلی و منطقی اعتبار سے ان سے جھگڑ ہی نہیں رہے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ سلف سے کلام اللہ غیر مخلوق مروی ہے تو اب تم مجھ سے یہ چاہتے ہو کہ کلام اللہ مخلوق کہلوا لو تو میں نہیں کہوں گا۔ امام احمد بن حنبلؒ کا مسلک یہ تھا کہ ہم نے عقیدے کی تفصیلات میں بھی وہیں رُک جانا ہے کہ جہاں سلف رک گئے تھے‘ وہاں سے آگے نہیں بڑھنا۔ یہاں تک کہ جب ان سے پوچھا گیا: لفظی بالقرآن مخلوق او غیر مخلوق ؟ یعنی جو ہم تلاوت کرتے ہیں وہ مخلوق ہے کہ نہیں؟ وہ تو مخلوق ہونی چاہیے؟ وہ کہتے ہیں: میں یہ بھی نہیں کہتا۔ میں دونوں سوالات کا کوئی جواب نہیں دیتا۔ میں توقف کرتا ہوں۔ میں یہ بھی نہیں کہتا: لفظی بالقرآن مخلوق ‘ اور میں یہ بھی نہیں کہتا: لفظی بالقرآن غیر مخلوق ۔ اس طرح کے مسائل سلف اور صحابہ سے ثابت نہیں ہیں تو میں یہاں توقف کروں گا اور کوئی بھی رائے اختیار نہیں کروں گا۔ بہر حال امام احمد بن حنبلؒ کا یہ مسلک تھا اور احتیاط اسی میں ہے۔ خصوصاً ہم جیسے لوگوں کے لیے کہ ہم بس یہ عقیدہ رکھیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کلام غیر مخلوق ہے اور اللہ کے کلام کی مانند کوئی کلام نہیں ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ جس طرح بے مثل اور بے نظیر ہیں اسی طرح اللہ کلام بھی بے مثل اور بے نظیر ہے۔ اگر جن وانس اور تمام مخلوقات جمع ہو جائیں تو اس کلام جیسا کلام نہیں لا سکتے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿۸۸﴾﴾ (بنی اسرائیل)

’’آپؐ کہہ دیجیے کہ اگر جمع ہو جائیں تمام انسان اور تمام جن اس بات پر کہ وہ اس قرآن کی مانند لے آئیں تو وہ نہیں لا سکیں گے اس کی مانند‘ اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔‘‘

امام احمد بن حنبلؒ اور حارث محاسبیؒ

یہ امام احمد بن حنبلؒ کا مسلک ہے اور ہمیں اصلاً یہی اختیار کرنا چاہیے۔ تفصیلات کو چھوڑ کے‘ ہم کہیں گے کہ کلام اللہ غیر المخلوق۔ جس طرح ہم بیٹھ کر عقیدہ پڑھاتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ معتزلہ نے یہ کہا وغیرہ‘ امام احمد بن حنبلؒ اس کے بھی قائل نہیں تھے۔ ایک دفعہ حارث المحاسبیؒ جو اس زمانے کے بہت بڑے بزرگ تھے‘ امام احمدؒ کی ان سے ناراضگی ہوگئی۔ یہ دونوں بغداد میں تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ ان کے متعلق کوئی اچھا خیال نہیں رکھتے تھے۔ امام حارث المحاسبیؒ کی کتاب ’’الرعایہ‘‘ ہے جو ’احیاء العلوم‘ کے مصادر میں سے ہے۔ جس طرح ’’قوت القلوب‘‘ ایک بڑا مصدر ہے احیاء العلوم کا‘ اسی طرح دوسرا سب سے بڑا مصدر ’’الرعایہ‘‘ ہے۔ امام حارث المحاسبی صرف صوفی نہیں بلکہ متکلم بھی تھے اور معتزلہ کے رد میں اور اس زمانے میں جو کچھ خیالات تھے ان کے ردّ پر ان کی کچھ کتابیں اور رسالے بھی ملتے ہیں۔ بہرحال امام احمد بن حنبلؒ کی ان سے ناراضگی تھی اور وہ ناراضگی کن وجوہات پر تھی‘ اس بارے میں مختلف آرا ہیں‘ لیکن ایک قوی رائے یہ ہے کہ ان کا کہنا یہ تھا کہ تم جب معتزلہ یا باطل فرقوں پر رد کرتے ہو تو پہلے ان کے شبہات بیان کرتے ہو پھر ردّ کرتے ہو۔ تمہارے شبہات بیان کرنے سے مجھے خطرہ یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کو شبہ سمجھ آجائے گا‘ ردّ سمجھ نہیں آئے گا۔ یعنی ان کے ذہن میں شبہ بیٹھ جائے گا اور پھر جو تم اوپر سے اپنے فلسفے جھاڑو گے اور تقریر کرو گے اور اس شبہ کا رد کرو گے وہ ہوسکتا ہے ان کی سمجھ میں بھی نہ آئے۔ لہٰذا جب تم عام کتابوں میں عوام الناس کے لیے اس طرح کی باتیں لکھ دیتے ہو تو ان کے بھٹکنے کے بڑے قوی امکانات ہیں‘ اور ہوسکتا ہے کہ تمہارے اسے بیان کرنے سے بہت سے لوگ جنہوں نے کبھی معتزلہ کا نام بھی نہ سنا ہو وہ معتزلی ہو کے بیٹھ جائیں۔ وہ کہیں گے کہ معتزلہ کی بات ہمیں بڑی قوی لگ رہی ہے‘ یہ تو عقلی بات ہے کیونکہ ’’عوام الناس کے دربار میں تو عقلی و علمی دلائل چلتے ہیں‘‘ (یہ جملہ طنزیہ ہے)۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ تم عوام الناس کو اس طرح کے بکھیڑوں سے دور رکھو۔ آج کل بھی یہ مسلک ایک لحاظ سے اہم ہے۔ یعنی کچھ باتیں علماء کے لیے ہوتی ہیں‘ کچھ باتیں عوام الناس کے لیے ہوتی ہیں۔ ہر بات عوام الناس کو بتانے کی نہیں ہوتی۔

سوشل میڈیا کا فتنہ

آج کل اس طرح کا دور ہے کہ ہر چیز ہر ایک کے لیے ہے۔ یہ سوشل میڈیا کا دور ہے۔ اس میں فیس بک پر جہاں جاہل بھی پڑھ رہا ہے‘ عالم بھی موجود ہے‘ آپ ایک تحریر چھوڑ دیتے ہیں جس میں بڑے دقیق قسم کے کلامی مباحث بھی ہوتے ہیں اور ادھر ادھر کی باتیں بھی ہوتی ہیں۔ اسے پڑھ کر عوام الناس بھٹک بھی سکتے ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ کا مسلک یہ تھا کہ ایسا کام نہ کرو۔ لہٰذا وہ بڑا احتیاط والا مسلک ہے۔ یہی وہ مسلک ہے کہ جواب ہمیں سمجھ میں نہیں آسکتا اور اگر کوئی اس طرح کی بات بھی کرے گا تو ہم کہیں گے کہ یہ تو آزادیٔ رائے‘ آزادیٔ فکر‘ free thinking یا اس طرح کی مروجہ اعلیٰ اقدار کے خلاف ہے۔ مغرب کے سوڈیڑھ سو سال آنے سے پہلے تک یہ طرزِ عمل تھا کہ مستند علماء بتایا کرتے تھے کہ یہ کتاب پڑھنی ہے اور یہ نہیں پڑھنی۔ یعنی عوام الناس کے لیے ایک نصاب بنایا جاتا تھا۔ انہوں نے ہر کتاب نہیں پڑھنی کہ جو مرضی اٹھا کر پڑھ لو اور گمراہ ہو جاؤ بلکہ یہ یہ کتابیں پڑھو

جن میں صحیح قسم کی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ جب تمہیں علم میں کوئی پختگی حاصل ہوجائے گی تو اس کے بعد تم آگے چلنا۔ اب یہ ہوتا ہے کہ علم میں پختگی‘ بنیادوں میں کوئی پختگی حاصل نہیں ہوتی۔ نہ اصول دین کا علم ہوتا ہے‘ نہ اصول فقہ کا علم ہے‘ نہ دین کی گہرائی کے ساتھ سمجھ بوجھ ہے اور بڑی بڑی چیزیں پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ فلاں کی بات‘ ادھر کی بات اور پھر سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ ان کی دلیل تو بڑی قوی ہے۔ حالانکہ یہ منہج علمی نہیں ہے۔ اس سے کوئی علم حاصل نہیں ہوتا۔ یعنی اپنی بنیادیں راسخ کیے بغیر جہاں بھر کی چیزیں پڑھنا شروع کر دیتے ہیں تو پھر کچھ پتا نہیں چلتا۔ نہ کوئی معیار ہوتا ہے جس پر دلائل کو پرکھ سکیں۔ پہلے اپنے روایتی علوم میں گہرائی پیدا کی جائے‘ اس کے بعد دنیا بھر کے فلسفے پڑھ لیں۔ اگر ہماری گہرائی اتنی ہو کہ گرامر کی کوئی چھوٹی سی کتاب پڑھ لی‘ دو چار اور چیزیں پڑھ لیں‘ اس کے بعد کہیں کہ اب ہم مغربی فلسفیوں کو پڑھنا شروع کرتے ہیں اور پھر ہم مغرب کا رڈ کر دیں گے تو اس سے ہوتا کچھ بھی نہیں ہے۔ وہی آپ کو متاثر کر دیتے ہیں۔ پھر آپ جو رڈ کرنے بیٹھتے ہیں تو اس میں رڈ پہلے اسلام پر ہو رہا ہوتا ہے۔ یعنی اسلام کی دھجیاں بکھیری جا رہی ہوتی ہیں۔ اس کے مسلّمات اور قطعیات کو ظنیات میں بدل رہے ہوتے ہیں اور اپنے خیال میں ساتھ احیاءِ اسلام بھی کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ پتا نہیں کس طرح کا احیاءِ اسلام ہے کہ جس میں پہلے قدیم اسلام کو مارنا ضروری ہے تاکہ نیا اسلام زندہ ہو سکے۔ بہرحال یہ سب باتیں منہج سلف کے خلاف ہیں لیکن آج کل لوگوں کو سمجھ نہیں آتیں۔ وہ ہر چیز پڑھنا بھی چاہتے ہیں اور ہر چیز پڑھنے کے بعد انہیں کچھ بھی نہیں پتا ہوتا۔

دقائق علم اور جلائل علم

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ﴾ (آل عمران: ۷۹)

’’بلکہ (وہ تو یہی دعوت دے گا کہ) اللہ والے بن جاؤ اس وجہ سے کہ تم لوگوں کو کتاب کی تعلیم دیتے ہو۔‘‘

اس میں ربّانی کی تعریف حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ کی ہے: الذی یُرَبِّی الناس بجلائل علم قبل دقائق۔ وہ لوگوں کی تربیت کرتا ہے۔ علم کے جلائل یعنی جو واضح علوم ہیں‘ جو بنیادیں ہیں ان کو پہلے دیتا ہے‘ پھر دقائق پر بعد میں آتا ہے۔ دقیق باتیں بعد میں بیان کرتا ہے‘ پہلے علم کی بنیادیں پختہ کرتا ہے۔ آج کل لوگوں کا طرزِ عمل یہ ہوتا ہے کہ ابھی ترجمہ شروع ہوا ہے اور ترجمے میں بھی آپ الحمد سے کچھ آگے ہی پہنچے ہوں گے تو ایک سوال داغ دیا جائے گا کہ وحدت الوجود کس کو کہتے ہیں؟ دقائق علم‘ یعنی ان سے طہارت کے مسائل پوچھ لو تو نہیں پتا کہ یہ کس طرح ہوتی ہے اور وضو کے آداب‘ فرائض‘ سنن اور شرائط کیا ہیں‘ کیا پتا نہیں ہے۔ البتہ وحدت الوجود کا پتا چل جائے‘ فلاں کشف کس کو کہتے ہیں‘ وغیرہ وغیرہ۔ یہ بالکل ایک باطل منہج علمی ہے اور اس سے ہمیں نجات حاصل کرنی چاہیے۔ پہلے کچھ علوم میں پختگی کریں۔ وہ علوم آلی ہوتے ہیں۔ یعنی عالیہ میں جو علوم مقصدیہ ہیں‘ جو اصل علوم ہیں‘ جو قرآن و حدیث ہے‘ اس تک پہنچنے کے لیے بھی کچھ علوم آلی جو انسٹرومینٹل سائنسز ہیں ان میں پختگی حاصل کرنی پڑے گی ورنہ وہاں بھی نہیں پہنچ سکتے۔ لہٰذا مقصد قرآن و حدیث ہی ہوتا ہے لیکن وہاں تک پہنچنے

کے لیے آپ کو کچھ علوم چاہئیں۔ ان علوم میں علم لغت‘ بلاغت‘ صرف‘ نحو‘ اصول فقہ‘ اصول حدیث اور اصول تفسیر شامل ہیں۔ یہ سب علوم مقاصد کے لیے ہیں۔ یہ بات ذہن میں رکھیں تو امام احمد بن حنبلؒ کے مسلک پر آپ کھڑے ہوں اور وہ مسلک یہی ہے۔ بس اتنی بات مانیے کہ کلام اللّٰہ غیر المخلوق۔ اس کے بعد اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اس قول پر توجہ دیجیے:

﴿اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ﴿۸۱﴾﴾ (الواقعة)

’’تو کیا تم لوگ اس کتاب کے بارے میں مداہنت کر رہے ہو؟‘‘

اس کا کلام اللہ ہونا اور تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ہونا ثابت ہو چکا ہے۔ کلامی مباحث سے بڑھ کر یہ بات غور وفکر کے قابل ہے کہ میرا کلام اللہ سے کیا تعلق ہے‘ میری قرآن مجید سے کتنی مناسبت ہے اور قرآن مجید مجھ پر کتنی تاثیر رکھتا ہے۔ قرآن مجید پڑھ کر میں واقعی اللہ کا قرب محسوس کرتا ہوں یا نہیں۔ یہ ساری باتیں غور کرنے کی ہیں۔ باقی کلام اللہ کی باریکیوں میں چلے جائیں‘ کلامی مباحث کو کھول کھول کر بیان بھی کر دیں‘ گہرائی میں اتر کر سمجھ بھی لیں اور کلام اللہ سے مناسبت پیدا نہ ہو سکے تو یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ کلام اللہ آپ کے لیے اجنبی نہ ہو۔ کلام اللہ سے آپ کو کوئی اوٹ اور حجاب محسوس نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴿۴۵﴾﴾ (بنی اسرائیل)

’’اور جب آپؐ قرآن پڑھتے ہیں تو ہم آپؐ کے اور اُن لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے‘ ایک مخفی پردہ حائل کر دیتے ہیں۔‘‘

جب آپ قرآن پڑھتے ہیں تو ہم آپؐ کے اور ایمان نہ رکھنے کے درمیان حجاب پیدا فرما دیتے ہیں۔ یہ جو قرآن سے حجاب ہے اس کو قرآن میں جابجا بیان کیا گیا:

﴿وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ﴾ (بنی اسرائیل: ۴۶)

’’ہم نے ایک حجاب ان کے دلوں میں ڈال دیا ہے کہ کہیں یہ اسے سمجھ نہ لیں۔‘‘

یعنی ہم نہیں چاہتے کہ یہ عالی شان کلام ان گھٹیا لوگوں کی سمجھ میں آجائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿۷۹﴾﴾ (الواقعة)

قرآن تک پہنچنے کے لیے‘ اس کی گہرائی میں اترنے کے لیے‘ اس میں غوطہ زنی کے لیے اپنے آپ کو پاک صاف کیا جائے۔ دل سے رذائل نکالے جائیں اور کلام اللہ کی عظمت کا احساس اپنے دلوں میں پیدا کیا جائے اور پھر کلام اللہ پڑھا جائے۔

تلاوتِ قرآن کے ظاہری وباطنی آداب

امام غزالیؒ کی ’’احیاء العلوم‘‘ میں سے ایک کتاب ہے جس کا نام ہے: کتاب آداب تلاوۃ القرآن! قرآن مجید کی تلاوت کے آداب کا بیان۔ انہوں نے اس میں دس آداب ظاہری اور دس آداب باطنی بیان کیے ہیں۔ اس

میں پہلا باب امام صاحب ہمیشہ فضیلت پر قائم کرتے ہیں کہ قرآن کی فضیلت‘ قرآن کی تلاوت کی فضیلت ۔ یہ سب آپ جانتے ہیں یہ بتانے کی حاجت بھی نہیں ہے ۔ دوسرا باب انہوں نے قائم کیا جس میں آدابِ ظاہرہ کا بیان ہے۔قاری وضو کے ساتھ بیٹھا ہو‘قرآن کی تلاوت کتنی کرنی ہے‘ ہفتہ میں کتنا پڑھا جائے۔پھر یہ کہ ترتیل کے ساتھ پڑھا جائے‘ پڑھتے ہوئے رویا جائے۔اسی طرح فرماتے ہیں کہ آیات کا حق ادا کیا جائے‘ سجدے کی آیت پر گزرے توسجدہ کرے‘ عذاب والی آیت ہے تو پناہ مانگے‘ جنت والی آیت ہے تو جنت کا سوال کرے۔ اسی طرح اعوذ باللّٰہ سے شروع کرے اور بالجہر یعنی اتنی بلند آواز سے تلاوت کرے کہ کم ازکم اپنے آپ کو سنائی دے۔ باقیوں کو نہ جگائے۔صحابہؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ تہجد میں اتنی آواز سے پڑھتے تھے کہ جاگنے والا سن لیتا تھا اور سونے والا جاگتا نہیں تھا۔پھر فرماتے ہیں کہ اچھی آواز میں یعنی ترتیل اور تحسین کے ساتھ پڑھے۔ یہ ساری باتیں ظاہری آداب میں سے ہیں۔ان پر عمل کرنا ضروری ہے۔قرآن مجید کو اچھی آواز سے پڑھنا اور اچھی آواز سے سننا قرآن سے مناسبت پیدا کرنے کے لیے اور قرآن سے حجاب دور کرنے کے لیے لازم ہے‘ وگرنہ قرآن مجید ایک اجنبی شے رہتی ہے۔ اگر آپ اچھی آواز سے سننے کا ذوق رکھتے ہیں تو اس کی دل پر تاثیر ہوتی ہے‘ چاہے آپ سمجھ رہے ہیں یا نہیں سمجھ رہے۔اسی طرح اچھی آواز سے پڑھنے کی تاثیر ہو تو پھر قرآن مجید سے حجاب نہیں رہتا۔

ہمیں بچوں کی تربیت کے حوالے سے اس پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔اگر بچپن سے ان کے اندر مزاج پیدا کریں گے قرآن سننے کا اور پڑھنے کا‘ اچھی آواز کے ساتھ اور بڑے بڑے قراء کا ان کے اندر ذوق پیدا کیا جائے تو یقیناً قرآن سے ایک مناسبت پیدا ہو جاتی ہے ۔ بعد میں ترجمہ اور پھر حفظ کرنے میں بھی بہت آسانی ہو جاتی ہے۔ہمارے نانا محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کو قرآن مجید کی تلاوت اچھی آواز کے ساتھ سننے کا خصوصی ذوق حاصل تھا تو اللہ کے فضل سے اس میں سے کچھ حصہ ہم لوگوں کو بھی ملا‘ اور یہ بہت بڑا احسان ہے اس اعتبار سے کہ اگر یہ نہ ہوتا تو شاید قرآن سے وہ مناسبت پیدا نہیں ہو سکتی تھی ۔ جیسا کہ ایک اور عالم نے کہا کہ اگر قرآن سننے کا ذوق ہو تو پھر یہ بحث فضول ہوتی ہے کہ موسیقی حلال ہے کہ حرام‘ اس لیے کہ آپ موسیقی سن ہی نہیں پاتے۔قرآن مجید کے حسن صوت سے آپ کی ایسی مناسبت ہو جاتی ہے کہ حلال بھی ہو تو نہیں سننی ۔ وہ ایک اضافی بحث ہے۔ بہرحال اس طرح کا کوئی ذوق پیدا ہو جائے اور ہم بچوں میں بھی پیدا کر سکیں تو بہت اچھا ہے‘ وگرنہ آج کل یہ ہو نہیں رہا۔ مجھے یاد ہے کہ کچھ عرصے پہلے تک چھوٹے بچوں میں زیادہ ہوتا تھا لیکن جب سے یہ فضول چیزیں آنا شروع ہو گئیں تو اب واقعی وہ ذوق نہیں ہے۔اب وہ موویز دیکھ رہے ہیں۔سیزنز ہیں جو لمبے لمبے چل رہے ہیں۔اسی طریقے پر قرآن کی تلاوت لمبے عرصے کے لیے بیٹھ کے سننا‘ کیسٹس کا ہونا‘ وہ کیسٹس بھی چلی گئیں۔جیسے جیسے کوئی شے آسانی سے ملنا شروع ہو جاتی ہے‘ اپنی وقعت کھو دیتی ہے ۔ مجھے یاد ہے کہ میں موٹر سائیکل یا سائیکل پر اردو بازار جا کر کیسٹیں خرید کر لاتا تھا کہ فلاں قاری صاحب کی کیسٹ وہاں سے ملے گی۔اتنی ساری کیسٹس جمع کی تھیں اور پھر ان کو اہتمام سے سنا جاتا تھا کیونکہ اتنی مشکل سے انہیں حاصل کیا گیا ہوتا تھا۔اب یوٹیوب پر ہر چیز دستیاب ہے۔

ایک لحاظ سے تو بڑی سہولت ہے یعنی وہ تلاوات کہ جو بڑی نادر تھیں اور ہمیں ناز تھا کہ ہمارے پاس اس کی کیسٹ ہے‘ فخر کرتے تھے‘ اب وہ سب یوٹیوب پر آ گیا۔ البتہ جس توجہ سے بیٹھ کر کیسٹ کو سنا جاتا تھا اور جس طرح اس کی قدر ہوتی تھی وہ تاثیر اب نہیں ہے۔ یوٹیوب پر سب کچھ موجود تو ہے لیکن سال ہا سال گزر جاتے ہیں لیکن وہ معمول نہیں بنتا کہ روزانہ بیٹھ کر ادب آداب کے ساتھ تلاوت سنی جائے۔ ادب آداب اور اس طرح کی چیزیں تو یوٹیوب نے ویسے ہی ختم کر دی ہیں۔

فہم عظمت کلام و متکلّم

پہلا ادب باطنی ہے: ہم نے اس میں سے ایک چیز پڑھنی ہے جو کلام کی حقیقت پر دلیل ہے۔ وہ کہتے ہیں: کلام کے جو آداب باطنہ ہیں ان میں سب سے پہلی شے کلام کی حقیقت کا جاننا‘ کلام کی تعظیم کرنا اور پھر متکلم کی تعظیم ہے۔ کہتے ہیں: فہم عظمة الکلام! کلام کی عظمت کا ادراک کر لینا۔ وعلوہ! اور اس کے علو کا۔ وفضل اللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ ولطفہ بخلقہ فی نزولہ من عرش جلالہ الی درجة افہام خلقہ! اور اس بات کا ادراک کرنا کہ اللہ کا کیا لطف ہوا اپنی مخلوق پر کہ اس نے اپنے جلال کے عرش سے نزول فرمایا مخلوق کو سمجھانے کے لیے۔ یعنی وہ کہاں اور تم کہاں! کہہ رہے ہیں کہ یہ اللہ کا فضل بھی کتنا بڑا ہے کہ وہ خالق جو لیس کمثلہ شیء جو اس کل وجود کا جس وجود کی انتہا بھی ہمیں معلوم نہیں‘ اس کے خالق نے میرے سے رابطہ کیا اور مجھے بتایا کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو اور کرنے میں بھلائی ہے اور نہ کرنے میں نقصان۔ بہر حال وہ کہہ رہے ہیں کہ ذرا اس کا ادراک انسان پہلے کر لے کس کا کلام ہے جو وہ پڑھنے جا رہا ہے۔

کہتے ہیں: فلینظر کیف لطف بخلقہ فی ایصال معانی کلامہ الذی ہو صفة قدیمة بذاتہ الی افہام خلقہ۔ اللہ کے لطف کو دیکھو‘ مہربانی کو دیکھو جو اس کی مخلوق پر ہوئی کہ اس نے اپنے کلام کے معانی کو پہنچا دیا۔ وہ کلام کہ جو صفت قدیمہ ہے‘ قائمہ بذاتہ ہے۔ الی افہام خلقہ۔ اپنی مخلوقات کے فہموں تک پہنچا دیا۔ وکیف تجلت لھم تلک الصفة فی طی حروف و اصوات ھی صفات البشر کیسے اللہ کی وہ صفت متجلی ہو گئی ان حروف اور اصوات کے پردوں میں جو صفات بشر ہیں۔ یعنی آواز اور حرف تو انسانی خواص ہیں جبکہ اللہ کی صفت قدیمہ اور کلام قدیم‘ وہ کیسے صفاتِ بشر کے پردے میں جلوہ گر ہو گئی۔

کہتے ہیں: اذ یعجز البشر عن الوصول الی فہم صفات اللّٰہ عزوجل الا بوسیلة صفات نفسہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اللہ کی صفات کا فہم حاصل کرنے سے عاجز ہے مگر اپنی صفات کے فہم کے وسیلے سے۔ تو اپنی صفات کے فہم کے وسیلے سے خدا کی صفات کا فہم حاصل ہوتا ہے۔ میں حرف اور صوت کے پردے کے بغیر خدا کی صفت تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کی اور بھی تفصیلات ہیں جو ایک دوسری کتاب میں انہوں نے بیان کی ہیں۔ اب اس کے بعد کلام کی عظمت کا ادراک جو ہر وقت ہمارے گھر میں موجود ہے‘ پڑھ بھی سکتے ہیں۔ پھر ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ گزر جاتا ہے کہ وہ کلام کھولنے کی نوبت نہیں آتی۔

فرماتے ہیں: ولو لا استتار کنه کلامه جلالة کلامه بکسرة الحروف لما ثبت سماع الکلام عرش ولا ثری۔ اگر اللہ کے کلام کا جلال اور اس کی کنہ حروف کی چادروں (کسوة لحروف) میں چھپی نہ ہوتی تو اللہ کے کلام کو سننے کی تاب نہ لاتے نہ عرش نہ فرش‘ نہ عرش نہ پاتال۔ کوئی شے اللہ کے کلام کو سننے کی تاب نہیں لاسکتی تھی اگر اللہ کا کلام ان حروف کے پردوں اور چادر میں چھپ کر نہ اترتا۔ کہتے ہیں: ولتلاشی ما بینهما من عظمة سلطانه وسبحات نوره۔ اور اگر اللہ کا کلام بغیر پردوں کے اُتر جاتا تو اللہ کی بادشاہی کی عظمت سے اور اس کے نور کی تپش سے کائنات کی ہر شے متلاشی ہوجاتی‘ عدم کا شکار ہوجاتی۔ کوئی شے اس کی تاب نہ لاسکتی تھی۔ سبحات نوره میں اس حدیث کی طرف اشارہ ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((حجابه النور)) اللہ کا حجاب نور ہے۔ ((لو کشفه)) اگر اللہ اسے اٹھادے ((لاحرقت سبحات وجهه ما انتهی الیه بصره من خلقه)) (صحیح مسلم‘ حدیث ۴۴۵) تو اللہ کے چہرے کی تاب تمام مخلوقات کو فنا کردے گی۔ یہی اللہ کا کلام بھی ہے‘ کیونکہ اللہ کا کلام صفت قدیمہ ہے۔ فرمایا کہ یہ حروف کے پردوں میں اتری ہے وگرنہ تو آپ سن نہیں سکتے تھے۔ ٹھہر نہیں سکتے تھے۔ بہرحال یہ وہی کلام ہے جس کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ﴾ (الحشر: ۲۱)

’’اگر ہم اس قرآن کو اُتار دیتے کسی پہاڑ پر تو تم دیکھتے کہ وہ دب جاتا اور پھٹ جاتا اللہ کے خوف سے۔‘‘

یہ قرآن جو حروف کے پردوں میں آرہا ہے‘ پردوں میں اترتا تب بھی پہاڑ تاب نہ لاتے۔ اس سے اللہ کے نبی ﷺ کی عظمت پر بھی علماء نے استدلال کیا کہ وہی کلام جو پہاڑ پر اترتا تو وہ دکاً دکا ہوجاتا وہی کلام:

﴿وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ١٩٢ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ١٩٣ عَلٰی قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ١٩٤ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ١٩٥﴾ (الشعراء)

’’اور یقیناً یہ (قرآن) تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے نازل کردہ ہے۔ اُترے ہیں اسے لے کر روح الامین (جبریلِ امین علیہ السلام)‘ آپؐ کے دل پر تاکہ آپؐ ہوجائیں خبردار کرنے والوں میں سے۔ (یہ نازل ہوا ہے) واضح عربی زبان میں۔‘‘

کہہ رہے ہیں:

ولولا تثبیت اللہ عزوجل لموسیٰ علیه السلام لما اطاق لسماع کلامه کما لم یطق الجبل مبادی تجلیه حیث صار دکاً دکاً

’’اگر اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام کو جمانہ دیتا تو آپؑ اس کلام کو سن نہ پاتے کہ جس طرح اللہ کی تجلی سے پہاڑ پاش پاش ہوگیا۔‘‘

پھر فرماتے ہیں:

ولا یمکن تفهیم عظمة الکلام الا بامثلة علی حد فهم الخلق

’’اللہ کے کلام کی عظمت کی تفہیم نہیں ہوسکتی مگر مخلوق کے فہم کے اعتبار سے کچھ مثالوں کے ذریعے۔‘‘

اب اس کے بعد ایک مثال بیان کرتے ہیں صرف سمجھانے کے لیے کہ: ان کل حرف من کلام اللہ

عزوجل فی لوح محفوظ اعظم من جبل قاف۔ اللہ کے کلام کا ہر حرف لوحِ محفوظ میں کوہ قاف سے بڑا ہے۔ یہ ایک تمثیل ہے۔ اس سے یہ سمجھ لیجیے گا کہ فزیکل شے ہے۔ پھر فرمایا: وان الملائکۃ علیھم السلام لو اجتمعت علی الحرف الواحد ان یقلّوہ ما اطاقوہ حتی یاتی اسرافیل فیرفعہ۔ اگر تمام فرشتے جمع ہو کر ایک ایک حرف اللہ کے کلام کا اٹھانا چاہیں تو نہیں اٹھا سکتے‘ یہاں تک کہ اسرافیل آتے ہیں تو وہ اٹھا لیتے ہیں۔ فیقلہ باذن اللہ عزوجل ورحمتہ لا بقوۃ وطاقتہ۔ اللہ کے اذن اور قوت سے وہ اللہ کے کلام کو اٹھانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ یعنی یہ صفت قدیمہ کی بات نہیں ہو رہی‘ وہ صفت قدیمہ جو حروف اور اصوات کے پردے میں اُتر چکی ہے لوح محفوظ میں۔ ﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ○ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ○﴾۔ علماء نے کہا کہ لوحِ محفوظ میں بھی صفت قدیمہ نہیں ہے بلکہ وہ پردے میں ہے‘ وہاں بھی حروف اور اصوات ہیں۔

امام غزالیؒ کے کلام کی تاثیر

اگر امام غزالیؒ کا اپنا کلام پڑھا جائے تو اس کے اندر ایک الگ تاثیر ہوتی ہے اور جب ترجمہ کیا جائے تو اس میں وہ تاثیر باقی نہیں رہتی کیونکہ یہ امام صاحب کا کلام نہیں۔ امام صاحب جب یہ کتاب لکھ رہے تھے تو اس وقت ان کی حالت اور قلبی کیفیات یقیناً ان کے قلم کے ذریعے قرطاس پر منتقل ہو گئیں۔ جس نے ترجمہ کیا ہوگا تو یہ تو اس کی ایک علمی حرکت ہے‘ وہ ترجمہ کرتے وقت امام صاحب کی قلبی کیفیات تو منتقل نہیں کر سکتا جو انہیں اپنی عظمت میں حاصل تھیں۔ لہٰذا چاہے آپ ترجمہ بہت ہی اچھا کر دیں‘ اس میں امام صاحب کا عکس نہیں آئے گا‘ خصوصاً ان کے قلب کا عکس جو اُس وقت ان کی تحریر میں تھا۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں تاکہ لوگ عربی سیکھیں۔ جب کسی بھی بڑے عالم کو ان کی اپنی اصلی زبان میں پڑھتے ہیں اور پھر جب اس کا ترجمہ پڑھتے ہیں تو زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ کئی دفعہ معانی تو وہی ہوتے ہیں لیکن محسوس ہوتا ہے کہ تاثیر رخصت ہو گئی‘ وہ تاثیر نہیں ہے اس کی۔ جیسے کلام اللہ کا بھی کوئی ترجمہ کر لیتا ہے تو ترجمہ پڑھ کے آپ کو وہ تاثیر محسوس نہیں ہو سکتی جو کلام اللہ کو سننے اور پڑھنے میں ہے۔ اسی پر قیاس کر لیں۔ امام صاحب تو پرانے آدمی ہیں‘ دورِ حاضر میں سید قطب شہید کی ’’فی ظلال القرآن‘‘ ایک تفسیر ہے۔ سید قطب ایک ادیب تھے۔ مصر کے بعض علماء نے ان کے بارے میں کہا کہ سید قطب اگر اخوان المسلمون کے غلط سلط کام (جو ان کے خیال میں تھے) میں نہ پڑ جاتے تو شاید مصر کے بڑے ادباء میں ان کا شمار ہو جاتا۔ یعنی ان کا قلم اتنا زور آور تھا۔ ’’فی ظلال القرآن‘‘ کی تحریر کے اندر تاثیر ہے‘ ادبیت ہے‘ چونکہ وہ واقعی قرآن کے عاشق اور مخلص تھے۔ جب ہم ’’فی ظلال القرآن‘‘ کا ترجمہ پڑھتے ہیں تو وہ تاثیر ختم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا سید قطبؒ کے خیالات اور افکار سے اختلاف ہوتے ہوئے بھی جب آپ ان کی تفسیر پڑھتے ہیں تو تاثیر محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان کی اتنی قوی تاثیر ہے۔ ان کی اپنی تحریر میں وہ تاثیر بعد میں نہیں ملتی۔ لہٰذا جس مصنف نے جس زبان میں کتاب لکھی ہے اور وہ مصنف واقعی کوئی اللہ والا تھا تو اس کی جو للّٰہیت اس کے کلام میں ظاہر ہوتی ہے وہ ترجمہ میں نہیں ہوتی۔ امام غزالی علیہ الرحمہ کے حوالے سے یہ معاملہ آپ بدرجہ اتم دیکھیں گے۔ یہ کتاب اس

نو سالہ عرصے میں لکھی گئی جب وہ اللہ کے لیے اور اپنے دل کی اصلاح کے لیے‘ سب کچھ چھوڑ کر‘ یہاں تک کہ اس وقت کی سب سے بڑی یونیورسٹی جو مدرسہ نظامیہ ہے‘ اس کے وہ ڈین تھے‘ یہ سب چھوڑ کے چلے گئے تو ان کی کیا کیفیات ہوں گے! کیا للّٰہیت ہوگی‘ کیا اخلاص ہوگا! وہ للّٰہیت اور اخلاص ان کے کلام میں نظر آئے گا۔ لیکن جب اس کا ترجمہ کریں گے تو یقیناً وہ بات نہیں رہے گی۔

خالق و مخلوق میں فرق و تفاوت لامحدود ہے

وہ کہہ رہے ہیں کہ سمجھ لو یہ صرف تمثیل کے لیے ہے۔ یہ تمثیل اس لیے ہے کہ اس میں انسان اور دوسرا جو وجود آئے گا اس میں فرق و تفاوت محدود ہے جبکہ انسان اور اس کے خالق میں ایک لامحدود فرق و تفاوت ہے۔ کہتے ہیں: جس طرح تم بہت حکیمانہ زبان رکھتے ہو اور تم ادیب ہو‘ تمہارے اندر بہت کمال ہے‘ زبان پر تمہیں عبور ہے لیکن پھر بھی جب تم نے اپنے کسی جانور کو کوئی بات پہنچانی ہوتی ہے تو تم اپنی فصاحت و بلاغت سے نزول کر کے اس کی سطح پر اُتر کر کچھ سیٹیوں میں اور کچھ تالی بجا کر اسے کلام سمجھاتے ہیں۔ بس اسی طرح سمجھ لو کہ جس طرح تم اتنا نزول فرماتے ہو تو بلا تمثیل اور بلا تکلیف اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور تمہارے درمیان فرق و تفاوت اس فرق و تفاوت سے جو تمثیل میں ہمارے سامنے آیا‘ کہیں زیادہ ہے‘ اور کوئی تشبیہ نہیں ہے بلا تشبیہ۔ تو کہاں اللہ کی وہ ذات تھی اور کہاں تم تھے کہ اپنی زبان میں اللہ کی صفت کلام کو سمجھ پاتے۔ بس دیکھ لو کہ اللہ کا کتنا لطف ہوا ہے اور اللہ نے تمہارا کتنا اکرام کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِيٓ ءَادَمَ﴾ (الاسراء:۷۰)

’’ہم نے بنی آدم کی بڑی عزت کی ہے۔‘‘

تو کتنا اکرام ہے کتنا لطف ہے‘ مہربانی ہے‘ شفقت کا مظاہرہ کیا ہے تمہارے اوپر کہ تمہاری زبان‘ تمہارے حروف اصوات میں اپنی صفت کلام چھپا کر تمہارے سامنے پیش کر دیا۔ فرماتے ہیں کہ اس طریقے پر جب تک تم کلام کی حقیقت نہیں سمجھتے‘ اور قرآن کھول کر بیٹھ جاؤ گے تو شاید اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے کلام کی عظمت کا ادراک نہ کر سکو۔ اس کلام کی عظمت کا ادراک کرو اور پھر متکلم پر غور کرو کہ وہ کون ہے‘ یعنی جس نے یہ کلام کیا۔ تو تعظیم کلام اور تعظیم متکلم: اللہ سبحانہ وتعالیٰ۔ یہ پہلی دو باطنی شرطیں یا آداب ہیں قرآن مجید کی تلاوت کی۔

صفتِ کلام کا اثر قرآن مجید سے تعلق ہے

بہرحال یہ کلام اللہ کے حوالے سے کچھ بنیادی باتیں تھیں۔ اس میں کوشش یہی کی گئی ہے کہ کلامی مباحث تھوڑے کم رہیں اور تذکیری بات زیادہ ہو‘ کیونکہ کلامی مباحث کئی دفعہ تاثیر میں کچھ کمی بھی کر دیتے ہیں۔ ہمارے لیے کلام اللہ ایک زندہ کتاب ہونی چاہیے۔ وہ صرف کلامی مباحث والی کتاب نہیں ہے۔ ہم ہر صفت میں دیکھ رہے تھے کہ اس کا ہمارے اندر کیا اثر ہونا چاہیے۔ صفتِ کلام کا اثر یہی ہے کہ قرآن سے تعلق‘ یعنی تعلق بالقرآن اور قرآن کی تاثیر کو محسوس کرنا‘ اس کی عظمت کا ادراک کرنا اور متکلم کی عظمت کا ادراک کرنا۔ اس صفتِ کلام کے

توسط سے یہ سب باتیں ہمیں حاصل ہونی چاہئیں۔ اگر یہ حاصل ہوگئیں اور آپ کو کلامِ نفسی اور کلامِ لفظی کا فرق معلوم نہ ہوسکا تو خیر ہے‘ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پوری زندگی بھی گزر جائے اور یہ فرق معلوم نہ ہو تو کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے۔ البتہ پوری زندگی گزر جائے اور کلام اللہ سے تعلق نہ ہو تو یہ بہت بڑی بات ہے۔ ہم سب کو یہ سوچنا چاہیے‘ اس لیے کہ ہم سب کا دعویٰ بھی یہی ہے کہ کلام اللہ ہی اصل علوم کا منبع اور سب سے بڑا علم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ)) اور خیریت کے بہترین ہونے کا معیار بھی یہی ہے۔

اس کے بعد ہم ذرا اپنی ترجیحات پر غور کرلیں تو پتا چل جائے گا کہ ہمارے قول وفعل میں کافی تضاد ہے۔ یعنی بڑے بڑے لوگ اپنے ذہین بچوں کے لیے بھی اگر ترجیحات قائم کریں گے تو وہ ترجیح یہ نہیں ہوتی کہ کبھی علوم قرآنیہ میں کوئی مہارت حاصل ہوجائے‘ یا عربی زبان میں مہارت حاصل کر کے کچھ سیکھ لیں اور قرآن کو سمجھ سکیں۔ یہ چیزیں ہمارے لیے ثانوی ہیں۔ ہوگا یہی کہ علوم دنیا بڑے ضروری ہیں اور اصل علم یہی ہے لیکن تم نے یہ علم حاصل کرنا ہے۔ بالآخر ان ترجیحات سے پتا چل جائے گا کہ ہم جھوٹے ہیں۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہمیں قرآن کی عظمت کا ادراک نہیں ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ کے سامنے ایک ہیرا اور پتھر پڑے ہوں اور آپ ہیرے کے فضائل بیان کر کے اٹھائیں پتھر۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ اگر ہیرے کی حقیقی معرفت حاصل ہوتی تو ہاتھ ہیرے کی طرف ہی بڑھتا۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ہمارا ایمان نہیں ہے لیکن ہمیں غور کرنا چاہیے کہ قرآن مجید اور اس کے علوم پر ہم کتنا وقت صرف کرتے ہیں اور اس کو سمجھنے میں ہم نے کتنا وقت گزارا ہے۔ جیسے ڈاکٹر صاحبؒ نے قرآن مجید کے حقوق والی کتاب میں بیان کیا کہ ۱۸‘ ۲۰ سال مختلف زبانیں اور علوم سیکھنے میں وقت گزار لیتے ہیں لیکن اتنا نہیں ہوتا کہ اللہ کے کلام کی زبان اس قدر سیکھ لیں کہ بغیر ترجمہ کے سمجھ آجائے۔ اس حوالے سے غور کیجیے۔ رجوع الی القرآن کورس بھی شروع ہو رہا ہے۔ اپنے اعزہ واقربا کو اس میں داخلے کی دعوت دیں۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے یہ کورسز شروع کرتے وقت یہی بات بیان کی تھی کہ جو دنیاوی علوم کے اعتبار سے پڑھے لکھے ہیں جبکہ دینی علوم کے حوالے سے اَن پڑھ ہیں‘ وہ ’’پڑھے لکھے اَن پڑھ‘‘ کی اصطلاح استعمال کرتے تھے‘ وہ لوگ آئیں اور قرآن سیکھیں۔ عربی زبان سیکھیں اور بنیادی علم حاصل کریں۔ اس کے بعد اگر ان کو محسوس ہو کہ اس علم میں وہ ترقی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو پھر ایک بنیاد مل جائے گی آگے بڑھتے چلے جانے کے لیے۔ اگر عربی زبان آجائے تو علومِ اسلامیہ کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بےحرمتی سے محفوظ رکھیں۔

کتاب نُما

تعارف وتبصرہ

تبصرہ نگار: احمد علی محمودی

نام کتاب : اسلام کا نظامِ حیات

مصنف : ڈاکٹر اسرار احمدؒ

صفحات: 264' قیمت (اشاعت خاص' مجلّد): 550روپے

ناشر: مکتبہ خُدّام القرآن' 36 کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور

ای میل: maktaba@tanzeem.org ویب پیج: maktaba.com.pk

رابطہ: 3-(042)35869501 0301-1115348

اسلام اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ دین ہے' جس نے انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے لیے اصول اور احکامات وضع کیے ہیں۔ اس کا نظامِ حیات ایک فرد کو بھی ترقی کی راہ پر گامزن کرتا ہے اور معاشرے کو بھی۔ یہ لائحۂ عمل اخلاقی' روحانی اور اجتماعی اعمال وافعال پر مشتمل ہے جس کی بنیاد ایک اللہ پر ایمان میں ہے۔

اسلام کا نظام حیات بانی تنظیم اسلامی وصدر موسس مرکزی انجمن خدام القرآن محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کے خطابات کا ایک اہم اور خصوصی موضوع رہا ہے۔ آپ نے اپنے منفرد اندازِ خطابت میں اس کے مختلف پہلوؤں کو قرآن وسُنّت کی روشنی میں اُجاگر کرنے کی بھرپور سعی کی ہے۔ آپ کا یہ سفر مہینوں نہیں بلکہ کئی سالوں پر محیط ہے۔

اس کتاب میں ڈاکٹر صاحبؒ کے پانچ اہم موضوعات پر خطابات ہیں۔ پہلے خطاب میں اسلامی نظامِ حیات کے اصول ومبادی بیان کرتے ہوئے اس کی فکری ونظریاتی اساس ''ایمان'' پر سیر حاصل گفتگو فرمائی گئی ہے۔ اس خطاب میں ڈاکٹر صاحبؒ نے واضح فرمایا ہے کہ فرد کی شخصیت کے دو رُخ ہیں یعنی اس کا فکر اور عمل' جن میں مطابقت از حد ضروری ہے' اسی سے اقوام اور معاشرے تشکیل پاتے ہیں۔ دوسرے خطاب کا موضوع ''اسلام کا اخلاقی اور روحانی نظام'' ہے' جس میں ان دونوں پہلوؤں پر مفصل گفتگو فرمائی گئی ہے۔ اس کے بعد تین خطابات اسلامی نظام حیات کے اُن تین گوشوں پر محیط ہیں جنہیں ڈاکٹر صاحبؒ Politico-Socio-Economic System (سیاسی وسماجی واقتصادی نظام) سے تعبیر فرمایا کرتے تھے۔

یہ پانچ خطابات 2010ء میں ترتیب وتدوین کے مراحل سے گزر ماہنامہ ''میثاق'' کے صفحات کی زینت

بنے تھے۔ بعدازاں اس مربوط سلسلہ خطابات کو قارئین کے لیے کتابی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

کتاب کا سرورق انتہائی دیدہ زیب جبکہ کمپوزنگ‘ پروف ریڈنگ اور طباعت بہت عمدہ ہے۔ کاغذ کا معیار بھی بہت اچھا ہے۔ یہ کتاب اسلامی تحریکات‘ واعظین ومربیین‘ تعلیمی اداروں‘ لائبریریوں‘ مکتبہ جات اور ہر گھر وفرد اور خاص طور پر عمرانیات سے دلچسپی رکھنے والے افراد کے لیے یقیناً ایک خوب صورت اور لاجواب تحفہ ہے۔

(۲)

نام کتاب : سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمّتوں کا ماضی‘ حال اور مستقبل
(اور مسلمانانِ پاکستان کی خصوصی ذمہ داری

مصنف : ڈاکٹر اسرار احمدؒ

صفحات: 180‘ قیمت (اشاعتِ خاص): 400روپے

ناشر: مکتبہ خُدّام القرآن‘ 36کے‘ ماڈل ٹاؤن‘ لاہور

اس وقت اُمّتِ مُسلمہ جن حالات سے دوچار ہے وہ انتہائی پریشان کن ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ پورے کا پورا کفر اہلِ اسلام کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے اُمڈ آیا ہے۔ اُمّتِ مُسلمہ کے خلاف کفر کی تمام ریشہ دوانیاں روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی ہیں۔ تباہی و بربادی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا جا رہا۔ ہر طرف بے بس مسلمانوں کی چیخ وپکار کی صدائیں ہیں۔ نوجوانوں کے سینوں کو چھلنی کیا جا رہا ہے۔ ماؤں‘ بہنوں اور بیٹیوں کی عزّتوں سے کھیلا جا رہا ہے۔ چادر اور چار دیواری کے تقدّس کو پامال کیا جا رہا ہے۔ معصوم بچوں کی سسکیاں ہیں کہ کوئی انہیں دلاسا دینے اور دل بہلانے والا نہیں۔ انہیں گھروں سے بے گھر کیا جا رہا ہے‘ یہ دردر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہیں۔ یہ سلسلہ ابھی نجانے کتنا اور باقی ہے۔

اُمّتِ مُسلمہ کی اس زبوں حالی پر دردِ دل رکھنے والا ہر دل خون کے آنسو روتا ہے کہ کہاں ہمارا وہ تابناک ماضی کہ جس کی مثالیں دی جاتی تھیں اور کہاں یہ حالات کہ سر اٹھا کر چلنا بھی دشوار ہو چکا ہے۔ ان گھٹا ٹوپ اندھیروں میں بانیٔ تنظیم اسلامی وموسس مرکزی انجمن خدام القرآن محترم ڈاکٹر اسرار احمد ﷫ کے افکار طلوعِ صبح کی مانند امید کی کرنیں بکھیرتے دکھائی دیتے ہیں کہ جس کے بارے میں علّامہ اقبال نے فرمایا تھا: ؎

کھول آنکھ‘ زمیں دیکھ‘ فلک دیکھ‘ فضا دیکھ
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!

یہ کتاب محترم ڈاکٹر اسرار احمد ﷫ کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جو اپریل 1993ء سے جولائی 1993ء کے دوران ’’تفکّر وتذکّر‘‘ کے زیرِ عنوان روزنامہ ’’نوائے وقت‘‘ میں شائع ہوئے تھے۔ یہ مضامین سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتوں‘ یعنی یہود اور اُمّتِ مُسلمہ کے ماضی‘ حال اور مستقبل کے ضمن میں محترم ڈاکٹر صاحبؒ کے

افکار وخیالات پر مشتمل ہیں‘ جس سے قارئین کو نہ صرف یہ کہ ماضی اور حال کا شعور وادراک حاصل ہوتا ہے بلکہ آنے والے دور کی ایک پُرامید اور خوبصورت تصویر بھی سامنے آتی ہے۔

کتاب کا سرورق‘ کمپوزنگ و پروف ریڈنگ شاندار ہے۔ ہر ہر ورق ایسا ہے کہ اس سے علم وادب کا نور جھلکتا دکھائی دے۔ یہ کتاب اسلامی تحریکات‘ واعظین ومربیین‘ تعلیمی اداروں‘ لائبریریوں‘ مکتبہ جات‘ ہر گھر‘ ہر فرد اور خاص طور پر تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے افراد کے لیے ایک خوب صورت اور بیش بہا تحفہ ہے۔

(۳)

نام کتاب : میرا قبولِ اسلام (مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ)

مصنف : پروفیسر غازی احمد (سابق کرشن لعل)

ضخامت: 244 صفحات‘ قیمت: 200 روپے

ناشر : المکتبۃ العلمیۃ ‘15۔لیک روڈ‘ لاہور

یہ ایک ایسے شخص کے قبولِ اسلام کی روداد ہے جس نے سکول کی تعلیم کے دوران اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر دین اسلام قبول کیا۔ والدین ہندو اور خاندان خوشحال تھا۔ کچھ وقت اس نے اپنے اسلام کو خفیہ رکھا۔ جب والدین کو معلوم ہوا تو انہوں نے تشدد کی انتہا کر دی۔ باپ نے اس قدر مارا کہ وجود لہولہان ہو گیا اور بے ہوشی طاری ہوگئی۔ خاندان کے بڑوں نے بہت سمجھایا۔ ہندوؤں کے بڑے بڑے لوگوں نے اجتماعی طور پر اس کو مجبور کیا اور سنگین نتائج کی دھمکیاں دیں۔ مگر غازی احمد نے ثابت قدمی کا حق ادا کر دیا۔ پولیس کی تحویل میں وقت گزارنا پڑا۔ عدالت میں پیش ہو کر ہندوؤں کی طرف سے دائر کیے گئے مقدمے کا سامنا کیا۔ ہر طرح سے دھمکایا گیا۔ ہر ممکن سزا دی گئی۔ اسی اثنا میں اسے خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت ہوئی جس سے اس کا یقین مزید مضبوط ہوا۔ اسلام کی سچائی ذہن میں اور زیادہ پختہ ہوگئی۔

مسلمان علمائے دین نے نہ صرف حوصلہ افزائی کی بلکہ ہر طرح مدد کرتے رہے۔ مصنف کو جب ذرا سکون ملا تو تعلیم کی طرف توجہ کی۔ وہ درمیانہ درجے کا طالب علم تھا مگر قبولِ اسلام کے بعد اس کی تعلیمی حالت روز بروز بیش از بیش بڑھنے لگی۔ وہ اس ساری ترقی کا سبب قبولِ اسلام کو قرار دیتا۔ نتیجتاً اس نے اسلامیات‘ عربی اور فارسی کے اعلیٰ امتحانات امتیازی حیثیت سے پاس کیے اور گورنمنٹ ٹریننگ کالج لاہور میں تقرری ہوگئی۔ بعد ازاں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ اُس وقت علامہ علاؤ الدین صدر شعبہ تھے۔ جب بوچھال کلاں میں کالج کا قیام عمل میں آیا‘ جو ان کا وطن تھا تو وہاں کے لوگوں کے اصرار پر یونیورسٹی کی ملازمت ترک کر کے بوچھال کے گورنمنٹ کالج میں لیکچرار کی پوسٹ قبول کر لی۔

غازی احمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں سرشار تھے۔ حج کے لیے گئے تو پہلے مدینہ منورہ میں حاضری دی۔ واپس آئے تو بلا معاوضہ دین اسلام کی تبلیغ میں لگ گئے۔ مقامی مسجد میں جمعہ کا خطبہ دینے لگے۔ وہ اس بات سے سخت پریشان تھے کہ مسلمانوں کا ایک اللہ اور ایک رسولؐ ہے' تاہم یہ فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ کہتے تھے کہ میرا مسلک قرآن وسنت ہے۔ پہلا نام کرشن لعل تھا جبکہ اسلامی نام غازی احمد اختیار کیا۔ تحقیقی ذہن کے مالک تھے۔ کتاب کے آخر میں انہوں نے ہندومت کی بے اعتدالیوں اور عیسائیت کے بے بنیاد عقائد کا ذکر کیا ہے جبکہ اسلام کی حقانیت کو واضح کیا ہے۔

اس کتاب کے پڑھنے سے جہاں ایمان ویقین کو جلا ملتی ہے' وہاں باطل مذہب کی بے ہودگیوں سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ میں نے کبھی اپنا پیریڈ ضائع نہیں کیا۔ اس طرح زندگی بھر رزق حلال کھایا اور اپنے بچوں کو کھلایا ہے۔ ان کے بیٹے بیٹیاں بھی باعمل مسلمان ہیں۔ مصنف ''مسلمان بھائیوں سے گزارش'' کے عنوان کے تحت استدعا کرتا ہے کہ '' آیئے ہم اسلامی طریق حیات کو اپنانے کا عہد کریں۔ اپنے عقائد' اعمال' کردار' اخلاق اور سیرت کو سنت نبویؐ کے سانچے میں ڈھالیں تاکہ روزِ محشر ہمیں آقا کے قدموں میں جگہ مل جائے۔''

افسوس کی بات ہے کہ اس قدر معلومات افزا اور ایمان تازہ کرنے والی کتاب کی کتابت شایانِ شان نہیں ہے اور نہ ہی کاغذ معیاری ہے۔ اس کتاب کو معیاری کمپوزنگ کے ساتھ اچھے کاغذ پر شائع کرنا چاہیے۔

(پروفیسر محمد یونس جنجوعہ)

۞ ۞ ۞

MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr. Israr Ahmad

Surah Al-A'raf

(The Heights)

(Recap of verses 163 – 181 of Surah,7, Al-A'raf, and exposition of Verses 182 – 206 of the same Surah, inclusive)

Translator's note:

For the sake of continuity and coherent explanation, most of the general discourse has been made by employing the 'male' as a prototype, which is in no way meant to be diminutive of the opposite gender or to disrespect the status of women.

Moreover, each verse (Verse) has been kept as a continuum in order to prevent the misrepresentation of meanings, which may occur when the verses are broken up and the translation of those verses becomes kaput when done in bits and pieces.

Cross-references taken from other parts of the Qur'an and the Hadith of the Messenger of Allah (SAAW) are provided in italics.

The Translation of the Holy Qur'an done by the Message International – USA (www.FreeQur'an.com) and edited by Saheeh International – UK, Dar Al Mountada – Saudi Arabia and Al Qummah – Egypt has been used in order to synchronize the use of modern English Language, which we believe will give a more accomplished sense of understanding to Today's mind.

Recap of verses 163 – 181 (inclusive) of Surah 7, Al-A'raf

Verses 163 through 181 commence with a discourse delving into the historical chronicles of Bani Israel, post the era of Prophet Moses *(AS)*. Allah *(SWT)* tasked the Israelites with observing the Sabbath, abstaining from all worldly engagements; refraining from cooking, demanding service from their slaves or cattle, and eschewing any form of labor or worldly pursuits. The whole day was sanctified for the remembrance of Allah *(SWT)*, the study of Torah, and the worship of the Divine. However, the Israelites openly transgressed these mandates. It was a divine trial that on the weekdays, their coastal waters teemed with just enough fish to sustain them, yet on the Sabbath, fish would swarm in abundance. The people of that land got divided into three factions: the first, those who were overtly transgressing the sacred laws of Moses *(AS)*; the second, who were silent spectators and although abstaining from transgression themselves yet failing to stop or deter others from such wrongdoing; and the third, steadfastly refraining from sin while actively admonishing and dissuading their brethren. When divine retribution befell the town, only those individuals belonging to the final category were spared, having demonstrated a profound reverence for Allah*(SWT)* and dutifully fulfilled their responsibilities.

So when they arrogantly persisted on what they were forbidden to do, Allah *(SWT)* sent his punishment and the transgressors became apes. It is then pronounced that the Jews will keep transgressing as a nation till the Day of Reckoning, except for those who are virtuous. Allah *(SWT)* subjects them to trials of both prosperity and adversity, perchance they may turn back, repenting to Allah *(SWT)*. The truth is that the Jews, in their erroneous belief as Lord's chosen people, knowingly transgress, assuming they will be pardoned and spared divine punishment. The Muslims are told that from their ranks, those who steadfastly adhere to the Qur'an, clutching it firmly, and after recognizing it as the divine word of Allah *(SWT)*, uphold its teachings with steadfast dedication and they ensure the establishment of prayer; they are the ones whose reward has been guaranteed in this verse. Following this, the Prophet Moses *(AS)* was imparted with the

Divine Law of Allah *(SWT)* at the base of Mount Sinai. It's crucial to clarify that the Israelites, by and large, though initially hesitant, willingly entered into the covenant with Allah *(SWT)*. It must be noted that just as the Israelites were bound by the covenant of Moses *(AS)*, the Muslim Ummah is bound by the covenant of the Qur'an and Holy Prophet *(SAAW)*. If we hold firmly to our covenant with Allah *(SWT)* and have Taqwa, only then we would become eligible for success in the Hereafter.

Starting from verse 172, all men are told that a covenant with Allah*(SWT)* is not the exclusive privilege of Israelites. In fact all human beings are bound in a covenant with Allah *(SWT)* and a Day will come when they will be made to answer how well they were able to observe that covenant. This covenant that occurred at the beginning of creation is of prime importance. Allah *(SWT)* made witness the souls of all human beings, from Adam until the Last Day, on themselves. The souls were asked: "Am I not your Lord". They all responded, "Indeed, we bear witness to it." Thus, on the Day of Judgment, they may not plead ignorance regarding this covenant. For their souls retain remembrance, and when Allah *(SWT)* holds them to account based on this covenant, their souls will recall. Thus on the Day of Resurrection, the Creator will awaken in humanity the recollection of the initial assembly when individuals made their covenant with Allah*(SWT)* and acknowledged Him as their Sole Lord. Indeed the revelations of Allah *(SWT)* through his Messenger *(SAAW)* are for the purpose of guiding people back to the truth. In this context, "Signs" denote the impressions left by knowledge of the truth upon the human heart, facilitating the recognition of what is true. "To return" signifies relinquishing rebellion and embracing obedience to Allah*(SWT)*. The parable of the transgression of *Balam ibn Ba'ura*, is then mentioned as a sign for human frailty. Allah *(SWT)* had endowed him with miraculous abilities, known as Karamat, granted to those who are close to Him. That is for non-Prophets, as the Messengers *(AS)* and Prophets (AS) are bestowed with miracles, or *Mujizat*. However, in his moral weakness, he brazenly transgressed the boundaries he knew he should observe. Satan led him from one act of depravity to another until he fell in with those wholly under Satan's sway, devoid

of sober judgment. Subsequently, Allah *(SWT)* likens this individual to a dog, with its protruding tongue and ceaseless drooling symbolizing insatiable greed and avarice. It is then decreed that wretched indeed are those who reject Allah's *(SWT)* revelations and Ayat (Signs), and the commandments of the Prophet *(SAAW)*. Those who go astray from the Right Path are the ones destined for eternal doom. They will be the losers in the Hereafter.

All the noble and virtuous names belong to Allah *(SWT)*. The Prophet Muhammad *(SAAW)* has conveyed to us ninety-nine of these names, most of which are found in the Qur'an, while some are derived from Hadith. Therefore, when supplicating to Allah *(SWT)*, one should invoke Him through His names. As for those who blaspheme against the names of Allah *(SWT)*, they will be held accountable for their actions and words. Their recompense will be in accordance with their deeds. Individuals are warned against the grave error of denial coupled with mockery, a stance they have taken towards the teachings of the Prophet Muhammad *(SAAW)*. It is declared that within the Muslim Ummah there will always remain a community or a group, as the Prophet Muhammad *(SAAW)* foretold, that would enjoin good and forbid evil. They will be guided by truth themselves and they will guide others by the truth. Thus, at no point in human history will there be 'absolutely no one' who upholds righteousness and guide others with integrity.

=======================================

Exposition of verses 163 – 181 of Surah Al-A'raf

<u>Verse 182</u>

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٨٢﴾

But those who deny Our signs – We will progressively lead them [to destruction] from where they do not know.

Indeed, those who disbelieve and reject the revelation on Prophet Muhammad *(SWT)* by Allah *(SWT)*, Allah *(SWT)* shall lead them step by step towards a destruction they cannot perceive. That destruction could manifest in this world too, and will definitively befall them in the Hereafter.

Verse 183

وَاُمۡلِيۡ لَهُمۡ ؕ اِنَّ كَيۡدِيۡ مَتِيۡنٌ ﴿۱۸۳﴾

And I will give them time. Indeed, My plan is firm.

Allah *(SWT)* grants respite to the transgressors, yet His grasp is swift and severe. If someone chooses the wrong path, he is allowed to proceed. Thus, Allah *(SWT)* grants them respite so that all the evil within them may manifest, revealing their true selves. Then Allah *(SWT)* will recompense them with the punishment they deserve. Indeed, Allah*(SWT)* gives the unbelievers respite, but surely, His Plan is mighty and unassailable.

Verse 184

اَوَلَمۡ يَتَفَكَّرُوۡا ٚ مَا بِصَاحِبِهِمۡ مِّنۡ جِنَّةٍ ؕ اِنۡ هُوَ اِلَّا نَذِيۡرٌ مُّبِيۡنٌ ﴿۱۸۴﴾

Then do they not give thought? There is in their companion [i.e., Muhammad] no madness. He is not but a clear warner.

The unbelievers and transgressors are being challenged here who do not reflect and contemplate, that the Prophet Muhmmad *(SAAW)* is the most lofty person ever witnessed in all senses of the word. The polytheists used to accuse that Muhammad *(SAAW)* was mad and unwise (May Allah *SWT* protect us from such utterings). However, their accusations were made out of bigotry and prejudice. They wanted to discredit the Messengers of Allah *(SWT)* by throwing such accusations at him. The Qur'an tells them to reflect earnestly, so that the truth could become evident to them and they could save themselves from a painful torment by submitting to Allah *(SWT)* and believing in the Prophet *(SAAW)*. The prophet *(SAAW)* lived in the city of Makkah, so he was their 'companion'. They had known him all his life. He was a 'brother' to them, belonging to the same tribe. He was the son of Abdullah ibn Abdul Muttalib, truly one of their own. Before the advent of his prophethood, Muhammad *(SAAW)* was known to all the Quraysh as a man of good morals and of sound mind. However, as he started calling people to accept the Message of God, they immediately dubbed him insane. So all their accusations were appalling as well as fabricated.

Verse 185

أَوَلَمْ يَنظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ مِن شَيْءٍ وَأَنْ عَسَىٰ أَن يَكُونَ قَدِ اقْتَرَبَ
أَجَلُهُمْ ۖ فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ ﴿١٨٥﴾

Do they not look into the realm of the heavens and the earth and everything that Allah has created and [think] that perhaps their appointed time has come near? So in what statement [i.e., message] hereafter will they believe?

The Qur'an, therefore, asks them to give serious thought to the teachings of the Prophet *(SAAW)* and to see if there is anything that is inconsistent with sanity, or is meaningless and irrational. Had people reflected on the order of the universe, or carefully considered even one single creation of Allah *(SWT)*, they would have been convinced of the truth of the teachings of the Prophet *(SAAW)*. They would have realized that whatever he said to refute polytheism, or to establish Allah's *(SWT)* unity or the accountability of man in the Hereafter, or about the necessity of man's surrender to Allah *(SWT)*, was corroborated by the entire order of the universe and every single atom of Allah's *(SWT)* creation.

The unbelievers, ineffectual as they are, fail to understand that no one knows when he will die. For death overtakes man totally unawares. Moreover, The Hour (الساعة) may indeed be very near. At this juncture, two-thirds of the Quran had already been revealed, as these are the final chapters of the Makki Surahs, and two-thirds of the Quran is comprised of these Makki revelations. This being the case, what will be the end of those who waste the time at their disposal until death or The Hour overtakes them and fail to find the direction to their salvation?

Verse 186

مَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ ۚ وَيَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿١٨٦﴾

Whoever Allah sends astray – there is no guide for him. And He leaves them in their transgression, wandering blindly.

Whomsoever Allah *(SWT)* has declared to have gone astray, and a seal has been set upon the heart of that person, then no one can guide such

a person or lead him to the right path. Allah *(SWT)* will leave such people in their insolence and rebellion, wandering blindly. There is no compulsion to choosing the path and once someone chooses the path of rebellion and transgression, and does not have even the willingness or desire to revert to the right path, then Allah *(SWT)* that person to keep following that path.

Verse 187

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ڤ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ۭ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

They ask you, [O Muhammad], about the Hour: when is its arrival? Say, "Its knowledge is only with my Lord. None will reveal its time except Him. It lays heavily upon the heavens and the earth. It will not come upon you except unexpectedly." They ask you as if you are familiar with it. Say, "Its knowledge is only with Allah, but most of the people do not know."

The appointed time (اجل) for an individual is the moment of their death.

The appointed time for a nation or community is when the period of respite granted by Allah *(SWT)* runs out and the final punishment in this world befalls them. The appointed time for the entire world is the Day of Judgment. The knowledge of all the aforementioned three types of appointed times is known to Allah *(SWT)* alone. The subject of this verse is the time of the advent of the Last Day, and that is known to Allah *(SWT)* alone which, in fact, is not known even to the Prophet *(SAAW)*, but most people do not know this.

O Muhammad *(SAW)*, they are asking you about the Day of Judgment, inquiring when it will come—that Hour, that appointed time.

Now they are asking about the appointed time for the entire world, the Day of Judgment. Tell them that the knowledge of the Hour is only with my Lord. No one will disclose its time except Him. It is embedded within the heavens and the earth. What does this mean? Just as my death is ubiquitous with me, with my own bodily processes

predetermined, so too is the death of the creation built into it. The time is set, and it will not come from outside but from within. Similarly, the end of this creation is fixed within the heavens and the earth and will come upon you suddenly.

They ask you as if you are eagerly searching for it. Tell them, the knowledge of the Day of Judgment is only with Allah *(SWT)*, but most people do not know this.

Verse 188

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا
مَسَّنِيَ السُّوْۗءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ١٨٨

Say, "I hold not for myself [the power of] benefit or harm, except what Allah has willed. And if I knew the unseen, I could have acquired much wealth, and no harm would have touched me. I am not except a warner and a bringer of good tidings to a people who believe."

As mentioned in the previous verse, the time of the advent of the Last Day is known to Allah *(SWT)* alone, which, in fact, is not known even to the Prophet *(SAAW)*. Had his knowledge encompassed everything – even things of the Unseen (غیب) and events that lie hidden in the future – he would have accumulated immense benefit and would have been able to avoid a great deal of loss owing to such foreknowledge. The line of argument used by the Quran here is a fact as well as a response to the demand of the unbelievers who were adamant that the Prophet *(SAAW)* should tell them about the actual time for the advent of the Last Day.

Verse 189

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا
فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَىِٕنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ١٨٩

It is He who created you from one soul and created from it its mate that he might dwell in security with her. And when he [i.e., man] covers her, she carries a light burden [i.e., a pregnancy] and continues

therein. And when it becomes heavy, they both invoke Allah, their Lord, "If You should give us a good [child], we will surely be among the grateful."

The crux and connotation of this Ayah also appeared at the beginning of this Surah. It is Allah *(SWT)* who created man as a single being from one soul, and from that soul, Allah *(SWT)* created his female mate so that he might find repose and satisfaction in her. When he covers her, she carries a light burden initially, which is not felt by the woman, nor is it apparent to others in the early stages of pregnancy. She goes about her daily life, unnoticed. However, as the pregnancy matures, the burden on the woman increases due to the growing foetus in her womb, and her physical and emotional states change, then both the husband and wife call upon Allah *(SWT)*, saying, "If You grant us a safe, sound, and good child, we shall be among the thankful and grateful people."

In truth, this verse seeks to refute polytheism. It is devoted to highlighting the implications of the postulate which even the polytheists affirm – that it is Allah *(SWT)* Who originally created the human species. They also acknowledge that every human being owes his existence to Allah *(SWT)*. Allah *(SWT)* also holds absolute power over the entire process leading to man's birth, right from the fertilization of the ovum in the uterus to its onward development in the form of a living being, then investing it with numerous faculties and ensuring its birth as a sound, healthy baby. No one has the power to prevent Allah*(SWT)*, if He so willed, from causing a woman to give birth to a physically or mentally handicapped baby. This fact is also equally acknowledged by monotheists and polytheists. It is for this reason that in the final stage of pregnancy, people are inclined to turn to Allah*(SWT)* and pray for the safe birth of a sound and healthy baby.

<u>Verse 190</u>

فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿١٩٠﴾

But when He gives them a good [child], they ascribe partners to Him concerning that which He has given them. Exalted is Allah above what they associate with Him.

This verse continues with the theme of refuting polytheism. It is the very height of man's ignorance and folly that after a sound and healthy baby has been born as a result of Allah's *(SWT)* will, man begins to attribute the child's birth and well-being to other deities, and they make offerings at the altars of false gods and goddesses. Exalted is Allah *(SWT)* above all that they associate with Him.

<u>Verse 191</u>

أَيُشْرِكُونَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ ﴿١٩١﴾

Do they associate with Him those who create nothing and they are [themselves] created?

All deities except Allah *(SWT)* – the false gods and goddesses – have no claim to deification themselves. Do the polytheists want to associate with Allah *(SWT)* false deities, who don't create anything, while they are themselves created.

<u>Verse 192</u>

وَلَا يَسْتَطِيعُونَ لَهُمْ نَصْرًا وَلَا أَنفُسَهُمْ يَنصُرُونَ ﴿١٩٢﴾

And they [i.e., the false deities] are unable to [give] them help, nor can they help themselves.

And these false gods have no power to help them, nor can they help themselves. They cannot assist others, nor can they aid their own selves. Not only do they not have the power to guide others, they do not even have the power to follow others or even to answer the call of their devotees. When the Prophet *(SAAW)* himself says, "I have no power even for my own benefit or harm; it is all in the hands of Allah *(SWT)*," what can be said of others? Indeed, all power, authority, knowledge and control belong to Allah *(SWT)* alone.

<u>Verse 193</u>

وَإِن تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدَىٰ لَا يَتَّبِعُوكُمْ ۚ سَوَاءٌ عَلَيْكُمْ أَدَعَوْتُمُوهُمْ أَمْ أَنتُمْ صَامِتُونَ ﴿١٩٣﴾

And if you [believers] invite them to guidance, they will not follow you. It is all the same for you whether you invite them or you are silent.

As mentioned earlier, this is one of the last Makki Surahs, and after twelve long years of Prophet Muhammad *(SAAW)* preaching to the polytheists of Makkah, conveying the message of Allah *(SWT)*, and reciting the Ayat of Allah *(SWT)* most of them they did not pay heed. Despite their hearts testifying to the truth and their inability to meet the challenges put forth by the Qur'an, they remained arrogant and unbelievers. It was because of their arrogance and positions as chiefs that they refused to submit to Allah *(SWT)* and obey the Prophet *(SAAW)*. Accepting Muhammad *(SAAW)* as a Prophet meant having to obey him, and their arrogance prevented them from doing so. Consequently, a seal was placed on their hearts. The Qur'an, thus, gives a damning verdict about those pagans that even if the believers keep calling them towards the right path and guidance, they will never follow the truth. They have already reached the point of no return. It is equal whether the Muslims continue calling them to the right path or remain silent.

Verse 194

إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ فَادْعُوهُمْ فَلْيَسْتَجِيبُوا لَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿١٩٤﴾

Indeed, those you [polytheists] call upon besides Allah are servants [i.e., creations] like you. So call upon them and let them respond to you, if you should be truthful.

These are two shades of shirk. One is the manifest shirk, which is idol worshipping. The polytheists of Makkah practiced it. They claimed that these figures carved from stone were not the 'real gods and goddesses' but only symbols for meditation, representing the gods and goddesses in the heavens who are beloved of Allah *(SWT)*. They believed that angels, whom they named Laat, Uzzah, and Manat, etc., were daughters of Allah *(SWT)*. Thus, they carved figures and images of those false deities to meditate and reach them.

There are two aspects worth considering here: The direct presence of the idol before them and the deities they truly call upon through these idols. They know the idol itself, which they carved, can neither hear nor speak. For them it served as a medium to call upon the 'angels' or, in some cases, the departed souls of pious people, whom they held as the partners of Allah *(SWT)* in His Authority, Control and Knowledge.

The latter is the second kind of shirk by proxy. In essence, both the medium and the false deity called through the medium were symbols and tools of their shirk.

The polytheists are told that the false deities that they call upon are themselves the bondsmen and slaves of Allah *(SWT)*. They too have been created by Allah *(SWT)* as His servants. So they cannot respond to their calls, proving that the polytheists are in grave error.

Verse 195

أَلَهُمْ أَرْجُلٌ يَمْشُونَ بِهَا ۖ أَمْ لَهُمْ أَيْدٍ يَبْطِشُونَ بِهَا ۖ أَمْ لَهُمْ أَعْيُنٌ يُبْصِرُونَ بِهَا ۖ أَمْ لَهُمْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ
بِهَا ۗ قُلِ ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ كِيدُونِ فَلَا تُنظِرُونِ ﴿١٩٥﴾

Do they have feet by which they walk? Or do they have hands by which they strike? Or do they have eyes by which they see? Or do they have ears by which they hear? Say, [O Muhammad], "Call your 'partners' and then conspire against me and give me no respite.

Polytheistic religions seem to have three common characteristics: (1)idols and images that are held as objects of worship; (2) some persons and spirits that are considered deities represented in the form of idols and images, etc.; and (3) certain beliefs which underlie their polytheistic rites. The Qur'an denounces all these. At this place, however, the attack is directed against the objects to which the polytheists directed their worship.

Verse 196

إِنَّ وَلِيِّيَ اللَّهُ الَّذِي نَزَّلَ الْكِتَابَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِينَ ﴿١٩٦﴾

Indeed, my protector is Allah, who has sent down the Book; and He is an ally to the righteous.

This is in response to the threats held out by the polytheists to the Prophet *(SAAW)*. They used to say to the Prophet *(SAAW)* that if he did not give up opposing their deities and denouncing them, he would be overwhelmed by the wrath of those deities and court utter disaster. The verse commands the Prophet *(SAAW)* to tell the polytheists to do whatever they can do, and that he would keep on doing whatever has been ordained by Allah *(SWT)*. Ultimately, the outcome will be

determined by Allah *(SWT)* alone. Indeed, Allah *(SWT)* is the protector of the Prophet*(SAAW)*, who has been sent with His Book and Allah *(SWT)* is the best protector. Allah *(SWT)* protects all the righteous people, and whoever comes under His protection cannot be harmed.

Verse 197

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ۝١٩٧

And those you call upon besides Him are unable to help you, nor can they help themselves."

As for those whom the polytheists are calling upon, whether they are angels, jinn, the souls of departed humans, idols or anything other than Allah *(SWT)*—they have no authority or power to help them. They cannot assist them and, indeed, they cannot even help themselves. This message is directed to all people who engage in practices of polytheism.

Verse 198

وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ۭ وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝١٩٨

And if you invite them to guidance, they do not hear; and you see them looking at you while they do not see.

The message in this verse is similar to verse 193 of the Surah. The Prophet *(SAAW)* and His companions are being told that that even if you keep calling the polytheists of Makkah towards guidance, they will never listen to you. After twelve long years of Prophet *(SAAW)* preaching to the polytheists of Makkah, conveying the message of Allah *(SWT)*, and reciting the Ayat of Allah *(SWT)* most of them they did not pay heed. Despite their hearts testifying to the truth and their inability to meet the challenges put forth by the Qur'an, they remained arrogant and unbelievers. It was because of their arrogance and their positions as chiefs that they refused to submit to Allah *(SWT)* and obey the Prophet *(SAAW)*. Accepting Muhammad *(SAAW)* as a Prophet meant having to obey him, and their arrogance prevented them from doing so. Consequently, a seal was placed on their hearts. The Qur'an, thus, gives a damning verdict about those pagans that even if the believers keep calling them towards the right path and

guidance, they will never follow the truth. They have already reached the point of no return. The Prophet *(SAAW)* is told that while it appears as if the polytheists are looking at you, but in reality, they are not seeing. They have become spiritually blind. They are spiritually deaf and dumb. The seals have been placed on their seeing, hearing and listening, as well as their hearts.

Abu Jahl was not physically blind, nor was Abu Lahab. They had eyes, and Abu Lahab was even known for his handsome appearance. But spiritually, they were dead. They had no living soul within them; their spiritual essence was dead. They had eyes but could not see. They had ears but could not listen. Their condition was like animals, even worse as they were spiritually dead.

Verse 199

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿١٩٩﴾

Take what is given freely, enjoin what is good, and turn away from the ignorant.

The Prophet *(SAAW)* and his companions are told to continue adhering to forgiveness and continue enjoining them to do right, while ignore and turn away from those who are spiritually dead.

It must be noted that some important directives are addressed in verses 199 through 202 to the Prophet *(SAAW)* regarding how he should preach the Message of Islam and how he should guide and reform people. The object of these directives is not merely to instruct the Prophet *(SAAW)*, but also to instruct all those who would shoulder the same responsibility after the Prophet *(SAAW)* till the Day of Judgement.

Verse 200

وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ إِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٠٠﴾

And if an evil suggestion comes to you from Satan, then seek refuge in Allah. Indeed, He is Hearing and Knowing.

The moment the proponent of the Islamic Message feels that he is being provoked by the excesses, mischief, and uncalled-for objections and accusation, he should realize that he is being influenced by Satan.

In such a situation he should immediately seek refuge with Allah *(SWT)*, and restrain himself lest his impulsiveness damage his cause. The cause of Islam can be served only by those who act cool-headedly. Only those steps are appropriate which have been taken after due consideration rather than under the influence of impulse and emotion. Satan, however, is ever on the look-out for opportunities to sabotage the efforts made in the cause of Islam. He, therefore, ensures that those who are working for the Islamic cause are subjected to unjust and mischievous attacks from their opponents. The purpose underlying this is to provoke the missionaries for the cause of Islam to engage in the senseless and harmful task of mounting counter-attacks against their opponents.

Verse 201

إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَإِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿٢٠١﴾

Indeed, those who fear Allah – when an impulse touches them from Satan, they remember [Him] and at once they have insight.

The appeal that Satan makes to those well-meaning, religious people is often couched in religious phraseology and is backed up by religious argument. But the fact is that those counter-attacks are undertaken merely under the impulse of man's lower self. Those who are God-fearing are always very sensitive to provocations under the impulse of Satan, and as soon as they become aware of such a provocation, they promote the best interests of the cause of truth rather than satisfy their vengeful feelings. As for those who are driven by egotistical impulses, they succumb to the promptings of Satan and are eventually set on an erroneous path. They fall victim to Satan, act virtually as his puppet, and subsequently their degradation knows no limit. They wrongly pay their opponents back in the same coin, tit for tat.

Verse 202

وَإِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ﴿٢٠٢﴾

But their brothers – they [i.e., the devils] increase them in error; then they do not stop short.

On the contrary, those who have no fear of Allah *(SWT)*, who have no desire to stay away from evil and who are in harmony with the ways of Satan – the brothers of the devils from within the human beings – such people are always given to the devils and they increase in evil thoughts and wrong-doing. The devils push then into transgressions and finally lead them to the Hellfire.

Verse 203

وَإِذَا لَمْ تَأْتِهِم بِآيَةٍ قَالُوا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ۚ قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِن رَّبِّي ۚ هَٰذَا بَصَائِرُ مِن رَّبِّكُمْ
وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿٢٠٣﴾

And when you, [O Muhammad], do not bring them a sign [i.e., miracle], they say, "Why have you not contrived it?" Say, "I only follow what is revealed to me from my Lord. This [Quran] is enlightenment from your Lord and guidance and mercy for a people who believe."

This question by the polytheists of Makkah was a taunt rather than a simple query. What the utterance implies is that if the claim to prophethood is genuine, it should have been supported by some miracle. This argument by the polytheists of Makkah is found in the very beginning of Surah al-Anam and we have mentioned earlier that Surah al-Anam and this Surah make a pair. The Prophet *(SAAW)* is commanded to tell his opponents in clear terms that he has no power to get whatever he wants. Being Allah's *(SWT)* Messenger, he is required to follow the directives of Allah *(SWT)* – the One Who has sent him and has granted him the Qur'an which has the light of guidance. The major characteristic of this Book is that those who seek guidance from it do indeed find the right way. The moral excellence visible in the lives of those people who accept the Qur'an is testimony to the fact that they have been blessed with Allah's *(SWT)* mercy.

Verse 204

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿٢٠٤﴾

So when the Quran is recited, then listen to it and pay attention that you may receive mercy.

The unbelievers are told to shed their prejudice and to abandon their deliberate indifference to the Qur'an. Whenever the Qur'an is recited to them, they stuff their fingers into their ears and make a lot of noise lest they or any others hear the Qur'an. They should better behave more maturely and make an effort to grasp the teachings of the Qur'an. It is quite likely that their study of the Book would ultimately make them share with Muslims the blessings of the Qur'an. This is an excellent, subtle and heart-winning approach which simply cannot be over-praised. Those who are interested in learning the art of effective preaching can benefit immensely by pondering over this Qur'anic verse.

Verse 205

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ
الْغٰفِلِيْنَ۝

And remember your Lord within yourself in humility and in fear without being apparent in speech – in the mornings and the evenings. And do not be among the heedless.

The command to remember the Lord signifies remembrance in Prayer as well as otherwise, be it verbally or in one's mind. Again the directive to remember Allah *(SWT)* in the morning and in the evening refers to Prayer at those times as well as remembering Allah *(SWT)* at all times. The purpose of this is to emphasize constant remembrance of Allah*(SWT)*. The truth is that every error and corruption, every heedlessness, stems from the fact that man tends to forget that Allah*(SWT)* is his Lord and that in his own part he is merely a servant of Allah *(SWT)* who is being tested in the world; that he will be made to render, after his death, a full account to his Lord of all his deeds.

Verse 206

اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ۝

Indeed, those who are near your Lord [i.e., the angels] are not prevented by arrogance from His worship, and they exalt Him, and to Him they prostrate.

Verily, those exalted angels who are near to their Lord are never prevented by arrogance to worship Him. They are devoted servants, constantly in worship and glorification of Allah *(SWT)*. To celebrate Allah's *(SWT)* praise signifies that the angels acknowledge and constantly affirm that Allah *(SWT)* is beyond any flaw, free from every defect, error and weakness; that He has no partner or peer; that none is like Him. They continuously prostrate before Him.

Whoever recites or hears this verse should fall in prostration as commanded by Allah *(SWT)*, practiced by the Prophet *(SWT)* and his Companions, and followed by the Muslim Ummah till date.

====================================

And Allah *(SWT)* Knows the Best!

جاری کردہ: ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

جدید تعلیم یافتہ حضرات وخواتین کے لیے دینی علوم کے حصول کا نادر موقع

رجوع الی القرآن کورس

(دورانیہ ۹ ماہ)

عرصہ 42 سال سے باقاعدگی سے جاری تعلیم

مضامینِ تدریس

پارٹ ۱ (سالِ اوّل) برائے مرد وخواتین

- تجوید و ناظرہ
- عربی گرائمر (صرف ونحو)
- ترجمہ قرآن (مع تفسیری ولُغوی توضیحات)
- دورہ ترجمہ قرآن
- قرآن حکیم کی فکری وعملی رہنمائی
- سیرت وشمائل النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
- مطالعہِ حدیث واصطلاحاتِ حدیث
- فکرِ اقبال
- فقہ العبادات
- معاشیاتِ اسلام
- اضافی محاضرات

پارٹ ۲ (سال دوم) برائے مرد حضرات

- عربی زبان وادب
- اصولِ تفسیر
- تفسیر القرآن
- اصولِ حدیث
- درسِ حدیث
- اصول الفقہ
- فقہ المعاملات
- عقیدہ (طحاویہ)
- اضافی محاضرات

☆ رجسٹریشن یکم رمضان سے شروع ہے۔ ☆ انٹرویو 02 ستمبر
آغاز کلاسز 03 ستمبر 2024ء (اِن شاءاللہ)

ایام تدریس: پیر تا جمعہ

اوقات تدریس: صبح 8:15 بجے تا 12:50

نوٹ: بیرونِ لاہور رہائشی صرف مرد حضرات کے لئے ہاسٹل کی محدود سہولت موجود ہے۔ ہاسٹل میں پہلے آیئے پہلے پایئے کے اصول پر رہائش دی جاتی ہے لہذہ خواہشمند حضرات پہلے سے رجسٹریشن کروالیں۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی خدماتِ قرآنی کا مرکز —— قرآن اکیڈمی

36-K ماڈل ٹاؤن لاہور
email:irts@tanzeem.org
www.tanzeem.org

زیرِ انتظام: مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور (رجسٹرڈ) —— 0316146661 - 04235869501-3

مزید تفصیلات کے لئے www.tanzeem.org

Quarterly **HIKMAT-E-QURAN** Lahore
Jul - Sep 2024 Vol. 43 No. 3

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ——— اور ——— سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے ——— اور ——— اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ — اور — غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ